تعویذِ حُب

ایمل رضا

ایمل رضا

آتش جہاں

السائی ہوئی دھوپ میں خوابیدہ انگڑائی کا خمار تھا۔ تاجدار سورج اپنی تمام تر تابانی سمیت نصف النہار کے زاویے سے آگے کی اور سرک چکا تھا۔ اور ہوا میں نوواردشام کی خنکی عود آئی تھی۔

خزاں آلود اشوک کے درخت اپنے باقی ماندہ اثاثے بھی اسی ناراض ہوا کے سپرد کرنے لگے تھے۔

پگھلی ہوئی برف کی نمی کے باعث تارکول چڑھی سڑک کچھ مزید کالی دکھتی تھی۔

اس نم آلود کالی اور چمکتی سڑک پر تیزی سے آتی وائٹ لیموزین کے سیاہ ٹائر چرچرا کر رکے تھے اور پھر اتنی ہی تیزی اور کسی قدر عجلت سے گاڑی کی پچھلی طرف کا دروازہ باہر کو دھکیلا گیا تھا۔ درمیانی ہیل والے سنگ جراحت کے سے سفید جوتے جن میں نقرئی پن کی جھلک تھی، نے سڑک سے برف اور برف سے اوک (OAK) بلڈنگ کے دروازے تک کی سیڑھیوں کا فاصلہ بھی اسی عجلت میں طے کیا تھا۔

دروازے کے اندر داخل ہو کر وہ غائب ہو گئی تھی۔ لیکن اپنے روشن سراپے کی پرچھائی اس نے کہیں پیچھے ہی چھوڑ دی تھی۔ اس کے سفید قیمتی برائیڈل (عروسی) گاؤن کا دامن جو پیروں کو چھوتا تھا اس سے نمی اور میلا پن جھلکتا تھا۔ دامن پر گرد اور نمی کے باعث بنی ہوئی بے ڈھنگی مصوری کے خشک و تر شاہکار ثبت تھے۔ اس جگہ آنے سے پہلے وہ مزید دو جگہوں پر جا چکی تھی۔

ایک سینٹرل پارک.... جو اس کی محبت کا ماخذ تھا۔

اور ایک "فالی" ریسٹورنٹ۔



مکمل ناول



جہاں کے شیف کبابوں کو سینکنے کے لیے میپل کی سوکھی لکڑی کا استعمال کرتے تھے اور میپل کی لکڑی پر پکے ہوئے وہ کباب شہرام کی مرغوب ڈش تھے' وہ اکثر اوقات اسی ریسٹورنٹ یا اس کے اردگرد ہی کہیں پایا جاتا تھا۔

آج وہ اسے ان دونوں جگہوں پر کہیں نہیں ملا تھا۔ یہ تیسری جگہ تھی۔ ایک طرح سے آخری بھی۔۔۔ وہ جانتی تھی کہ پھر اس کے بعد کیا تھا۔۔۔ صرف دربدر کی خاک۔۔۔ لامتناہی تنہائی۔۔۔ اور خود ساختہ عذاب کی اذیت۔

شہرام کے کمرے کا دروازہ بند تھا' اسے اس کی توقع نہیں تھی' اگرچہ اس کا دل پہلے ہی اس کی گواہی دے چکا تھا۔

وہ واپس لوٹی تھی۔

لینڈلیڈی کے دروازے تک پہنچ کر اس نے اطلاع گھنٹی کو دبایا نہیں تھا' بلکہ دبائے ہی رکھا تھا' وہ اتنی عجلت اور اتنی بے قراری کی حالت میں تھی کہ اسے یقین تھا کہ اگر اب۔۔۔ ہاں اگر اب وہ کہیں بھی کسی غلطی یا کوتاہی کی مرتکب ہوئی تو وہ شہرام کو دوبارہ اپنی پوری زندگی میں کبھی نہ دیکھ سکے گی۔

وہ ٹھیک سوچ رہی تھی' لیکن غلطی کرنے کا وقت آنے والا نہیں تھا۔ وہ وقت آکر جاچکا تھا۔۔۔ اور وہ شہرام سمیت' بہت کچھ کھودینے والی تھی۔

دروازہ کھلا اور لینڈلیڈی ایمنڈا گھنٹی کے اس غیر مہذبانہ استعمال پر اپنی ناگواری چھپا نہ سکیں۔

"فرمائیے!" بیانکا کو پہچاننے میں انہیں چند ہی لمحے لگے تھے۔ یہ چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ چند لمحے بھی اس لیے لگے کہ وہ آج حد سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔

بیانکا کو دیکھ کر اور وہ بھی اس حالت میں دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔

"شہرام۔۔۔ شہرام کہاں ہے؟"

وہ تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تھی اور مایوس واپس آئی تھی۔ اس کے باعث اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ سوال اس نے بمشکل مکمل کیا۔

لیڈی ایمنڈا کا منہ اتر گیا۔ اس سوال کا جواب یقیناً" بیانکا کو مزید پریشان کردینے والا تھا۔ وہ ایک ٹک اس کا سراپا دیکھے گئیں۔

وہ وائٹ برائیڈل گاؤن میں ملبوس۔۔۔ تازہ کھلے زخم کی مانند گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک اور مہنگے ہیروں سے دمکتے زیورات پہنے ہوئے تھی۔ وہ کہاں سے آرہی تھی۔۔۔ کیا چھوڑ کر آرہی تھی۔ ان سارے سوالوں کے جواب اس کے تن سے لپٹی ایک ایک چیز دے رہی تھی۔ برعکس ہربات کے اس روپ میں وہ اتنی دلکش اور اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اگر اس کے چہرے پر ہوائیاں نہ اڑ رہی ہوتیں تو لیڈی ایمنڈا اسے گلے سے لگا کر بے تحاشہ چوم ڈالتیں۔

"وہ چلا گیا۔۔۔" انہوں نے سچ بتادیا۔

"کہاں۔۔۔؟" زمین اس کے پیروں کے نیچے اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی طرح کانپنے لگی۔

"واپس۔۔۔ اپنے ملک۔۔۔ البانیہ۔" ایمنڈا نے اداسی سے کہا۔

"کب۔۔۔؟"

"کل صبح۔۔۔ اس نے سارا حساب چکتا کردیا تھا اور وہ اپنا سارا سامان لے گیا ہے۔۔۔ میں نے خود اس کا ایئر ٹکٹ دیکھا ہے۔"

آخری بات کا اضافہ انہوں نے اس لیے کیا تھا کہ بیانکا یقین کرلے کہ وہ کل صبح چلا گیا ہے۔

وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ وہ واقعی چلا گیا تھا۔ گرنے سے بچنے کے لیے بیانکا نے سیڑھیوں کی ریلنگ کو تھاما تو ایمنڈا کو پتا چل گیا کہ ان کی بات کو سچ ہی مانا گیا ہے۔

دہلیز اور سڑک کے درمیان کی سات سیڑھیوں کو اس نے پشت کی طرف سے طے کیا تھا۔ جیسے واپسی کے سفر میں بھی آگے ہی جانے کی خواہش مند ہو۔ اور چکنی سیڑھیوں پر سے پھسلتے خود کو سنبھالنے کا اس نے

تردد ہی نہیں کیا تھا۔ اب اس سے زیادہ وہ اور کہاں گرے گی۔ کھائی میں گرنے والے کے پاس ایک اطمینان تو ہوتا ہے اگرچہ لمحے بھر کے لیے ہی سہی کہ وہ اب اس کے بعد مزید نیچے کہاں جائے گا۔

شاید وہ اس بھاگ دوڑ سے تھک چکی تھی یا خود کو سنبھالتے سنبھالتے ہار گئی تھی۔ برف کی پتلی سی تہہ چڑھے آخری اسٹیپ پر ڈھے ۔۔۔ گئی۔ سارے مشکل امتحانوں کے بعد یہ آسان امتحان اس کی زندگی میں ابھی باقی تھا۔ جس میں وہ پہلے سے ہی فیل ہو چکی تھی۔

اس کا نم گاؤن مزید گیلا ہونے لگا اور ٹھنڈے ماربل نے برف کی یخ بستگی کو اس کے پورے وجود میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا اندھیرا بھر گیا تھا جیسے مدتوں ان آنکھوں نے سورج نہ دیکھا ہو۔

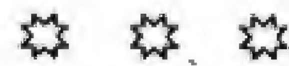
"شہرام ۔۔۔!" اور یہ لفظ اس کے لبوں سے یوں ادا ہوا جیسے اس کی پور پور زخمی ہو۔

گھٹنوں میں منہ دے کر اس نے وہ آسن جما لیا جو کسی کو ابدی طور پر پالینے کے لیے رواں رکھا جاتا ہے۔

"شہرام ۔۔۔ اب تم مجھے کیسے ملو گے شہرام ۔۔۔ اب میں تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈوں شہرام ۔۔۔"

خلاؤں میں دیکھتے ہوئے اس نے زوال آلود سورج سے کہا۔

اور موسم نے نہ بدلنے کی جیسے بے شمار قسمیں اٹھا لیں۔



رات سبز تھی ۔۔۔

مور کے چندر کی طرح ۔۔۔ اور چاروں اور پھیلی ہوئی تخم ریحاں کے پودے سے نکلنے والی کڑوی کسیلی خوشبو کی مانند ۔۔۔

وہ نیویارک شہر کا ایک پر رونق، پر ہجوم اور وسیع چوراہا تھا ۔۔۔ ایک طرح سے انجان بھی، بے گانگی سے چلتے چلتے وہ رک گیا تھا۔

اور یہاں کے باسیوں کے خیال کے مطابق اس جگہ سے بے دھیان ہو کر کوئی بد قسمت ہی گزر سکتا تھا۔

وہ بد قسمت تھا۔ بلاشک و شبہ ۔۔۔ اس نے دھیان دیا۔ ایسا بے ارادہ ہوا تھا۔ اس کی چندھی آنکھوں کو ایک نیون سائن کی چمک خیرہ کر رہی تھی۔ ایک بلیک سائن بورڈ جس پر سرخ لائٹس سے شائن کلب لکھا تھا۔ اور یہ سرخ لائٹ کسی نیزے کی طرح اس کی سوتی جاگتی آنکھوں میں گھسی چلی جاتی تھی۔ اس تحریر میں ایک پہچان کی چمک بھی تھی۔

ٹھیک چھ ماہ پہلے وہ اپنے یونیورسٹی فیلوز کے ساتھ یہاں سے گزرا تھا تو اس کے ایک دوست ڈیوڈ نے جو اپنے آبائی شہر کی ایک ایک سڑک ایک ایک عمارت کا تعارف ایک اعلانیہ فخر کے جذبات سے مغلوب ہو کر کرواتا تھا' نے اس کلب کے بارے میں بتاتے ہوئے اپنی گفتگو کو خصوصی لفظوں سے سجایا تھا۔

"اس کلب کے پاس بیانکا نامی ایک کمال کا اثاثہ ہے۔ تم اسے نیویارک کی ایلیکس چنگ (برطانیہ کی مشہور گرل D.J) کہہ سکتے ہو۔ میں ایک ماہ پہلے اس کلب میں گیا تھا اور ان دھنوں کی بازگشت جیسے ابھی بھی میرے کانوں میں قید ہے اور ۔۔۔"

ڈیوڈ شاید ابھی بیانکا کی تعریف میں مزید بولنے کا ارادہ رکھتا تھا' لیکن شہرام نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

"کیوں ۔۔۔ D.J (Disco Jocky) کا کام ایسا کون سا مشکل ہوتا ہے۔ محض ریکارڈ شدہ گانوں اور دھنوں کو چلانا ۔۔۔"

"یہاں آنے سے پہلے میرا نظریہ بھی کچھ کچھ تم جیسا ہی تھا۔ بٹ مائی ڈیئر فرینڈ ۔۔۔ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو میوزک کو جنون کی طرح خود پر طاری کر لیتے ہیں ۔۔۔ اور ان سے بھی کم وہ ہیں جو اس جنون میں دوسروں کو بھی کھینچ لاتے ہیں ۔۔۔ یہ لڑکی ان ہی میں سے ایک ہے۔ یہ صرف ریکارڈ شدہ میوزک نہیں چلاتی۔ اس کی انگلیوں میں Tishrei cloud (ابر نیساں) قید

ہے۔ وہ جس کے بارے میں داستان گو کہتے ہیں کہ جو جب برستی ہے تو سارے غم بھلا دیتی ہے۔"

شہرام کے علاوہ باقی سب دوست ڈیوڈ کی اس تقریر سے متاثر ہونے لگے تھے۔ شہرام بھی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا' لیکن وہ صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ کلب بند تھا اور کون جانتا تھا کہ شام تک ان کی توجیہات بدل جائیں گی۔

لیکن آج ایسا کچھ بھی نہیں ہونے والا تھا۔ اس کی ساری توجیہات کو زنگ لگ چکا تھا۔

شہرام چند لمحے اس بورڈ کو پڑھتا رہا۔ پھر اس نے خود کو کلب کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے پایا۔

"دیکھتے ہیں یہ ابرِ نیساں میرے غم پر برستی ہے کہ نہیں۔"

کلب ایک وسیع ہال پر مشتمل تھا۔ جس کی چھت کافی اونچی تھی۔ آدھے سے زیادہ حصے پر ٹرانسپیرنٹ کرسٹل کا ڈانس فلور بچھا تھا۔ داخلی راہداری کے سامنے دائیں بائیں دو لمبے کاؤنٹر تھے۔ جن کے پیچھے بارٹینڈر اپنے اپنے کرتب دکھانے میں مشغول تھے۔ ان دونوں کاؤنٹرز کے درمیانی خلا کے اوپر تقریباً" سروں سے اونچا اٹالین طرز کا ٹیرس قدرے باہر کو نکلا ہوا تھا۔ جہاں بہت بڑے سائز کا Pioneer Disk Four (چار ڈسک والا سسٹم) اور چھ انسانی قد کے سائز کے ساؤنڈ ڈیک پڑے ہوئے تھے۔ ٹیرس کی پشت پر V.Jing BoRD (ایک بورڈ جس پر میوزک کے ساتھ مختلف رنگ و اشکال آتے اور جاتے ہیں) نصب تھا۔ میوزک کی آواز تیز تھی' لیکن یہ ابتدائی وارم اپ میوزک تھا۔

وہ اپنے لیے کوئی ایسا حصہ تلاش کرنے لگا جہاں اسے کوئی ڈھونڈنے سے بھی کھوج نہ سکے۔ اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر تھک گئیں۔ آوازیں... شور... ہنسی مذاق... چھیڑ چھاڑ... خوشبوئیں' قہقہے' ادائیں' نخرے' ڈانس' ڈرنک سب کچھ آپس میں بری طرح مدغم ہو چکا تھا۔ ڈسکو لائٹ اور مختلف سمتوں میں لگی مختلف اشکال گھڑتی لیزر لائٹ کا نہ ختم ہونے والا سفر۔ شہرام کو اپنے اندر داخل ہونے کے فیصلے پر پچھتاوا ہوا تھا' زندگی کی طرف بلانے والی ان چیزوں سے شاید ان لوگوں کو ہی واسطہ ہوتا ہے' جو زندہ ہوں... وہ زندہ تو تھا' لیکن صرف ظاہری طور پر... جن کے دل مر جاتے ہیں' وہ عجز کا ایسا ہی روپ خود پر چڑھا لیتے ہیں... یہ وہ دوغلا لباس ہے جو ستر پوشی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔

اپنی پشت پر اسے کسی کی ٹکراؤ کا ہلکا سا احساس ہوا تو وہ پیچھے پلٹا تھا۔ ایک سانولی لڑکی شوخ ادا سے مسکرا رہی تھی۔

"Would you like...." لڑکی اپنا مدعا بیان کرتے کرتے رکی تھی۔ شہرام کو دیکھ کر اس کی اپنی رنگی رنگائی اور تہہ شدہ بات کی گرہیں کھل کر بکھر گئی تھیں۔

"ہائی سنتھ" (دیوتا اپالو کا دوست' بہت خوب صورت) لڑکی چلائی تھی۔

"ڈرنک کی آفر تو مجھے کرنی چاہیے۔" لڑکی اپنے بے تاب دل کی دھڑکنوں پر جیسے قابو پانا چاہتی تھی' لیکن کر نہیں پا رہی تھی۔

"جیسا میں سوچ رہی ہوں اور ویسا ہی ہوا تو میں دعا کروں گی کہ آج کی رات قیامت والے دن ہی ختم ہو' بولو کون سا مشروب پینا پسند کرو گے؟"

شہرام اس بات کا مطلب بخوبی جانتا تھا' اس نے سر کو اتنی آہستگی سے ہلایا کہ سانولی لڑکی سمجھ نہ سکی کہ وہ ہاں کہہ رہا ہے یا ناں... لیکن اس کے چہرے پہ آئے سنجیدہ تاثرات دیکھ کر وہ کچھ مایوس اور کچھ نامرادگی کی سی کیفیت سے مغلوب ہو کر اداس ہو گئی۔

"تمہارا ابھی کوئی قصور نہیں... وہاں سے آنے والوں کو ہمیشہ گوری چمڑی ہی مرعوب کرتی ہے۔" لڑکی کہہ کر آگے چلی گئی تھی۔

شہرام کھڑے کھڑے واپسی کے لیے راستہ کھوجنے لگا۔ تب ہی تیزی سے چلتا میوزک قدرے آہستہ ہوا تھا۔

"Boys and girls and now the night is about to start"

(لڑکے اور لڑکیوں ۔۔۔ اور اب ۔۔۔ رات کی شروعات ہوئی چاہتی ہے)

اعلان کرنے والی کی اپنی آواز میں کانچ ٹوٹنے کی سی کھنک تھی۔

"انتظار ختم ہوا چاہتا ہے۔۔۔ بیانکا ہمارے درمیان ہے۔۔۔ جو۔۔۔"

آگے کے الفاظ کانوں میں نہیں پڑے تھے۔ لڑکے اور لڑکیوں نے بیانکا کے نام پر ہی وہ شور اٹھایا تھا جو جنگل کی راتوں میں سیار کسی شکاری کو دیکھ کر اٹھاتے ہیں۔۔۔ سب اپنی اپنی سرگرمیاں چھوڑ کر ڈانس فلور پر بھاگے تھے۔ وہ بار کے قریب کسی مجسمے کی طرح ایستادہ رہا۔ کاؤنٹر کی سطح پر آدھے بھرے اور خالی جاموں کا ڈھیر پڑا رہ گیا تھا۔ اور اس کے سامنے کے سارے بار اسٹول جو پہلے پر تھے۔ اب خالی ہوئے پڑے تھے۔ وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"اورنج جوس ۔۔۔" بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

بارٹینڈر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

"دوسرے مشروب بھی زیادہ مہنگے نہیں ہیں۔۔۔" وہ کوئی راز بتانے کی سی آواز میں بولا۔

"اورنج جوس ۔۔۔ پلیز۔" شہرام نے قدرے آنکھیں نکال کر اور اپنے مطالبے پر زور دے کر کہا تو بارٹینڈر نے اپنا چہرہ تاثرات سے عاری کرلیا اور مطلوبہ فرمائش پوری کرنے کے لیے کاؤنٹر کے دوسری طرف چلا گیا۔

وہ ایسے اونچے اسٹول پر بیٹھا تھا جہاں سے سر سے اونچا ٹیرس با آسانی نظر آرہا تھا۔

"سر۔۔۔!" اس کے سامنے اورنج جوس ٹیوب گلاس میں رکھ دیا گیا اور تب ہی ٹیرس کے بڑے اور چوڑے سانپ بل ستونوں کے پیچھے سے وہ برآمد ہوئی تھی۔

بیانکا۔۔۔ چہرے پر بھرپور مسکراہٹ سجائے۔

شہرام گلاس کو ہونٹوں سے لگانا بھول گیا۔۔۔ اور نظروں کو جھکانا بھی۔۔۔

حسن اور درد۔۔۔ یہ وہ دو چیزیں ہیں جو انسان کسی بھی حالت، کسی بھی موسم میں محسوس کرتا ہے۔

ڈانس فلور پر منتظر ہجوم نے مختلف آوازیں نکال کر اس کا استقبال کیا تھا اور یہ آوازیں شروع ہو کر پھر رکتی نہ تھیں۔ ان بے معنی آوازوں میں صرف ایک لفظ کی گردان شہرام کی سمجھ میں آئی تھی۔

Ritual Di Amour (محبت کی رسم۔۔۔ رابرٹ تھامس کا مشہور گیت)

پھر جیسے دوسری فرمائشوں نے بھی اس فرمائش کے چاہنے والوں کی بڑی تعداد کے آگے اپنی اپنی فرمائش کے ہتھیار ڈال دیے اور سب مشترکہ طور پر اسی کی

فرمائش کرنے لگے۔

ٹیرس پر طمطراق سے کھڑی بیانکا مسکرائی تھی اور پھر اس نے اپنا بایاں ہاتھ ہوا میں لہرایا تھا۔ یہ اشارہ تھا۔ فرمائش کو قبول کرنے کا۔۔۔ پھر اس نے ہیڈ فون کانوں میں لگایا تھا۔

چھ انسانی قد کے برابر کے ڈیک نے Yanni (موسیقار) کی موسیقی کو فضا میں بکھیرنا شروع کیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اور سنتے ہی سنتے اس گانے میں بہت سے انجان راگوں اور بدیسی دھنوں نے بھی آبسیرا کیا تھا۔

رقص کرو میرے ساتھ۔۔۔ بغیر رکے
بن جاؤ ایک طوفان۔۔۔ میرے سمندر کا

تھرکنے والوں نے نہ رکنے کا جیسے عزم کر لیا تھا۔
پانچ منٹ۔۔۔ دس منٹ۔۔۔ پندرہ منٹ۔۔۔
وقت گزرا اور۔۔۔

کوئی چیز ٹوٹ کر شہرام کے آس پاس بکھر گئی۔۔۔ وہ اٹھنا چاہتا تھا لیکن اٹھ نہ سکا تمہید بھی نہ باندھ سکا۔ ڈانس فلور اس کی نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی دور بہت دور۔۔۔ دسترس سے باہر ہو گیا۔

اسے ناچنا نہیں آتا تھا۔ پر یہاں اس کے ناچ کے رموز پر دھیان دینے والا تھا ہی کون 'پتا نہیں اس کی سماعت بھی اس کی طرح لاچار اور کمزور ہو چکی تھی یا بیانکا واقعی کسی اندرونی درد کو مرتب کر رہی تھی۔ کم از کم شہرام کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

گردن اٹھا کر اس نے ٹیرس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ حسن جس کی صرف ایک بوند پورے سمندر کے پانی کا رنگ بدل دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اپنی آمد کے وقت سے یکسر مختلف عکس دے رہی تھی۔

Owen smith (مصور) کی پینٹنگ ابوالہول کا عکس۔

ابوالہول۔۔۔ جس میں ایک لڑکی پریشان چہرہ لیے ابوالہول کے پیچھے کھڑی ہے۔ اس کا سہارا لیے۔۔۔ اس کو پناہ بنائے۔۔۔ جس کی بھنوؤں میں پریشانی کے باعث گڑھے پڑ چکے ہیں۔

یہ لڑکی تو خود پناہوں کی تلاش میں بھٹکتی لگتی ہے۔
یہ مجھے کیا سہارا دے گی۔

شہرام کو اس کے بند ہونٹوں 'نیم وا آنکھوں 'کشادہ پیشانی اور دہکتے رخساروں کے نیچے کسی پوشیدہ کرب کا عکس نظر آیا 'وہ کرب جسے وہی سمجھ سکتا ہے 'جو خود کسی کرب سے گزرا ہو۔

"ابر نیساں۔۔۔"

اسے ڈیوڈ کا بیانکا کی تعریف میں بولا گیا لفظ یاد آیا اور ڈیوڈ سمیت ڈانس فلور پر ناچتے ان سب کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔

شاید ان سب پر x.t.c کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ اس لڑکی کی انگلیوں میں تو پروا قید ہے 'جو پرانے زخم بھی جگا دیتی ہے۔ یہ انگلیاں نئے زخم مندمل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ شہرام نے فیصلہ کن سوچا۔

وہ یہاں اپنا غم غلط کرنے آیا تھا۔ لیکن شاید کلب کے کمال کے اٹاثے کے پاس بھی اس کا علاج نہیں تھا۔ یہاں بھی وہی نوحہ ساز کی تان پر کستا تھا 'جس نے البانیہ سے یہاں تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ماتم کر لیتا تو شاید راحت پا لیتا۔۔۔ لیکن اسے خود کو بسمل رکھنے کا سودا ہو گیا تھا۔

بے دل اور بے روح کی طرح شہرام نے ایک اچٹتی سی نگاہ دوبارہ بیانکا پر ڈالی تھی۔

سرخ ربن میں قید اس کے تمام تر گھنے اور سیاہ بال عروبہ کے استوائی جنگلوں کی عکاسی کر رہے تھے۔

"مجھے خود میں قید کر لو۔۔۔ ہنسو 'رقص کرو اور بالوں کو لہرا دو۔۔۔"

دفعتاً "بیانکا نے ربن میں انگلی ڈال کر بالوں کو بڑے پیار سے اس سے آزاد کروایا تھا۔

لہریے دار بال کھلے تھے۔۔۔ لہرائے تھے۔۔۔ جھٹکا دے کر بے ترتیب کیے گئے تھے۔

اور عروبہ کے استوائی جنگلوں میں جیسے زلزلہ آ گیا تھا۔



"رات کی شروعات ہوتی ہے۔۔۔ انتظار رخصت

ہوا چاہتا ہے۔۔۔ بیانکا ہمارے درمیان ہے۔۔۔"
مارٹا نے اس کی آمد کا اعلان کانچ ٹوٹنے کی سی کھنک سے کیا تو وہ بے دلی اور سست روی سے ٹیرس کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
"تو دن کا وہ وقت دوبارہ آگیا ہے جب مجھے خود کو خود اذیتی کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ہے۔۔۔" اس نے سوچا اور سانپ بل ڈیزائن والے ستونوں کے پیچھے سے نکلنے سے پہلے اپنے چہرے پر سچی مسکراہٹ۔۔۔ نیچے ایک ہجوم اس کا منتظر تھا۔
"Ritual Di Amour" سب نے چلا چلا کر فرمائش کا اظہار کیا تھا۔ اس نے ہاتھ لہرا کر ان کی فرمائش کو قبول کیا اور Yanni کی موسیقی کو آن کیا تھا۔
"ایک گیت اور اندھیرا ماضی۔۔۔ اور اس اندھیرے کا خوف۔۔۔ کہ جس میں آنکھیں کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی اور جو کھولو تو کچھ نظر نہیں آتا۔۔۔" اس نے خود کلامی کی تھی اور دوسری طرف وائلن کی دھنوں والی ڈسک کو لگایا تھا۔۔۔
مجھے اس اندھیرے ماضی کو یاد رکھنا ہے۔۔۔ اس اندھیرے میں ایک چیز چمکتی تھی۔۔۔ حیفہ مام کی آنکھوں میں آئے آنسو۔۔۔ جن کی یاد مجھے آگ کی طرح جھلساتی ہے۔۔۔ مجھے اس آگ کی۔ آبیاری کرنی ہے۔۔۔ دنوں' سالوں کے گزرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔۔۔ صدیوں کی لگاتار بارش بھی اس آگ کو ٹھنڈی نہیں کرپائے گی۔۔۔ یہاں تک کہ یہ آگ ایک تناور درخت بن جائے گی۔۔۔ ایک زہریلا درخت پھر اس درخت پر ایک سیب اگے گا۔۔۔ اور وہ زہریلا سیب گناہ گاروں کو چکھنا پڑے گا۔
گانے کے بول
میرے ساتھ رقص کرو۔۔۔ بغیر رکے
طوفان بن جاؤ۔۔ میرے سمندر کا
اس نے سازوں کی دھنوں کو لگا کر انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ کرنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو مصروف کرلیا تھا۔

"ہنسو۔۔۔ رقص کرو۔۔۔ اپنے بالوں کو لہرادو۔" ربن میں انگلی ڈال کر اس نے بالوں کو آزاد کرکے لہرایا تھا۔
چچا جلال نے اسے انہیں بالوں سے پکڑ کر ایک زوردار قسم کا جھٹکا دیا تھا۔
"حرام زادی کر دستخط۔۔۔" وہ نفرت سے چلائے تھے۔
اسے حرام زادی کا مطلب نہیں پتا تھا۔۔۔ اس کی ماں پانچ وقت کی نمازی تھی اگر اسے حرام زادی کا مطلب پتا ہوتا تو وہ اسی وقت مرجانا پسند کرتی۔
"الو کی پٹھی کر دستخط۔"
وہ "سی" کے بٹن کو اوپر کرتی چلی گئی تھی۔
"کر دستخط۔۔۔ کر دستخط۔۔۔ کر کر۔۔۔ کر کر۔۔۔" آواز نے ان لہروں پر سفر کیا تھا جو کسی صورت ہموار نہیں تھیں۔
"طوفان بن جاؤ۔۔۔ طوفان بن جاؤ۔۔۔ طوفان بن جاؤ۔"
"یہ ایسے نہیں مانے گی۔۔۔ اپنی ماں پر گئی ہے۔۔۔ ڈھیٹ' کمینی' مکار' حرافہ۔" شہناز تائی نے کہا تھا۔
"ڈھیٹ' کمینی' مکار' حرافہ۔"
چاروں ڈسک اس کے دونوں ہاتھوں کے نیچے Scratching (ایک ایفیکٹ) سے گزرنے لگیں۔
"مکار' مکار' مکار۔"
B اور D کے Volume کو اس نے اس قدر شدت سے تیز کیا تھا کہ وہ Pioneer کسی اچھی کمپنی کا نہ ہوتا تو دونوں بٹن یقیناً" ٹوٹ گئے ہوتے۔
گانے کے بول۔
تمام بصارتیں تم پر مرتکز ہو جائیں
اور دکھا دیں۔۔۔ اپنی وارفتگی
Keytar اور Lira کی دھنیں ہال پر چھا گئیں تو رابرٹ کی آواز دھم ہوتے ہوتے گم ہونے لگی۔
اپنی ذات محبت کی اس رسم کے حوالے کردو
ایرانی Arpa نے اپنے پیہم جادو کا آغاز کیا تھا۔
نیچے لڑکے لڑکیاں اگر پاگل نہیں ہوئے تھے تو ہو جانے کے قریب ضرور تھے۔

"ایک جوتی مارو اس کے منہ پر۔۔۔ کیسے نہیں مانے گی یہ" اسے فیروزہ چاچی کے الفاظ یاد آئے تھے۔

تپلی ڈسک نکال کر اس نے اس طرح پرے پھینکی تھی جیسے وہاں فیروزہ چاچی کھڑی ہوں اور وہ ان پر بارود کا گولہ پھینک رہی ہو' بیانکا کی اس حالت میں مارٹا کو اپنے فرائض کا بخوبی علم ہوتا تھا۔

"تیل چھڑک کر زندہ جلا دو۔۔۔ اس کو اور اس کی ماں کو۔۔۔" ان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ پھر انہوں نے ایسا کیا کیوں نہیں۔۔۔ وہ تب ہی مرجاتی تو اس طرح روز روز تو جل جل کر نہ مرتی۔

لیکن موسیقی جلنے لگی تھی۔۔۔ کسی چڑیل کے لمبے ناخنوں کی کھرچ کی سی آواز پیدا کر رہے تھے اور رابرٹ کی آواز "صور" کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔

اجنتا کے غاروں میں چھپی چمگادڑوں کا چنگھاڑنا بھی ان آوازوں سے کہیں زیادہ بھلا تھا۔ بیانکا کے کان ان کراہوں کے عادی ہو چکے تھے۔ پھر بھی ہر روز ٹیرس پر بے حسی سے اپنی ڈیوٹی انجام دینا اسے اندر تک بھگو دیتا تھا۔

نیچے x.t.c کے نشے میں چور ہو کر سب ناچتے جاتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اس کی انگلیوں سے نکلتی دکھ کی تحریر کو پڑھ سکتا۔ کسی کے پاس وہ آنکھ نہیں تھی' جو اپنی ہی مردہ سلطنت پر خود کو ختم کرلینے کے ارادے باندھنے والی قلو پطرہ کے بھیانک عزائم جان سکتا۔

بیانکا کو ان سب کی بے حسی پر رونا سا آگیا' لیکن وہ اسی طمطراق سے کھڑی رہی۔ جیسے اس کے لیے آنے والا ٹروجن (کاٹھ کا گھوڑا) اس کی آنکھوں کے آگے ہی جل رہا ہو۔

ڈیڈ الیاس کہتے تھے۔۔۔ "اپنے اپنے درجے اور حیثیت کی بات ہے' بٹی۔۔۔ اوس تر تو کرسکتی ہے' لیکن پاک نہیں۔"

"آپ نے یہ کیوں نہ بتایا ڈیڈ کہ اپنی اپنی نظر اور محسوسات کی بھی بات ہوتی ہے۔ کچھ لوگ آتش فشاں کے پھٹنے کو بھی نظارہ سمجھ لیتے ہیں۔۔۔ جبکہ کچھ کو اس کی حدت کا خوف ہی بھسم کردیتا ہے۔"

اس نے ڈیڈ الیاس کی روح کو جواب دیا اور نیچے ڈانس فلور پر نظر ڈالی۔

"میرا دکھ ان سب کے لیے نظارہ ہے۔

ہے کوئی جو اس نظارے سے مبہوت نہ ہو۔۔۔"

وہ مزید جوش سے اسکریچنگ کرنے لگی اور اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"نہیں کوئی نہیں۔۔۔"

ڈانس فلور کے اردگرد کی ساری جگہ خالی تھی۔ لوگ آرہے تھے۔۔۔ جانے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔ یہ اطراف کی دیواریں اگر اتنی مضبوط نہ ہوتیں تو شاید یہ بھی جھوم اٹھتیں۔۔۔ نہیں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی انگلیوں کی فسوں کاری کے حملوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوپاتا۔

چاروں سمت کا موازنہ کرتی اس کی نظر اچانک کہیں اٹکی تھی۔۔۔ ایک چیز تھی جو ساکت تھی۔ گہرے منجمد پانی میں مدتوں سے پڑی بند صدف کی طرح ایک دو انچ کی لکڑی کا ٹکڑا۔

فقط۔۔۔ ایک دو انچ کی لکڑی کا ٹکڑا۔۔۔



جس بے دلی سے اس نے ٹیرس کی سیڑھیاں طے کی تھیں۔ واپسی پر اس سے کہیں زیادہ شکست خوردگی نے اس کے گرد حصار قائم کردیا تھا' خلاف معمول آج اس کے قدم ڈریسنگ روم میں جانے کے بجائے بار کاؤنٹر کی طرف اٹھے تھے۔

اس کی آٹھ ماہ کی جاب میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ وہ ٹیرس سے اتر کر سیدھا ڈریسنگ روم میں نہیں گئی تھی۔ آج کے دن کی طرح پچھلے آٹھ ماہ میں کوئی چیز گہرے منجمد پانی میں مدتوں سے پڑی بند صدف کی طرح ساکت بھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ اس ٹکڑے کے مالک کے بالکل مدمقابل آبیٹھی تھی۔

اس ساکت ٹکڑے نے اسے ٹیرس پر ہی بڑی

بھیانک پریشانی سے دوچار کردیا تھا "ہے کوئی جو اس نظارے سے مبہوت نہ ہو۔"

اس نے تفاخر سے سوچا اور تب ہی چاروں طرف کا موازنہ کرتی اس کی نظر کہیں اٹک کر بھٹک گئی تھی۔

یہ ایسا عجیب 'انوکھا اور توقع سے برعکس تھا کہ بڑی دیر تک وہ اسے فریب نظر ہی سمجھتی رہی تھی۔

فورڈسک Pioneer اس کی انگلیوں کے نیچے جیسے پتھر کا ہو گیا۔ ہیڈ فون اس کی گردن میں جھولنے لگا اور آگ پکڑتی تانوں پر گویا قطب شمالی کی سرد ہواؤں نے قابض ہو جانے کی ٹھان لی۔

اور بیانکا کی آنکھوں میں بے قراری کی سیاہی بھر گئی۔

ڈسکو لائٹ کی کبھی مدھم اور کبھی تیز ہوتی روشنی میں اس نے ناچتے کودتے ہر ایک لڑکے اور ہر ایک لڑکی کو بہت غور سے دیکھا۔ "وہ" ان میں نہیں تھا۔ اس نے قریب کھڑی مارٹا اور سیڑھیوں پر ایستادہ دو حبشی باڈی گارڈز کو دیکھا۔ وہ ٹکڑا ان کی دسترس میں بھی نہیں تھا۔ پھر... پھر اس نے اپنی شکست کو کہاں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہنسی میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح مچلنے لگی۔

دائیں طرف بار کاؤنٹر کے چھ بار اسٹول خالی تھے۔ بائیں طرف بار کے چھ... نہیں وہ پانچ خالی تھے۔ اور ایک پر وہ... وہ بیٹھا تھا... شہرام زلاری...

دور کہیں طبل بجا... اور ایک جنگ سی چھڑ گئی۔

ایک مقابل... ایک ضد...

پندرہ منٹ کی مزید زور آزمائی نے اسے نڈھال کر دیا۔ بیانکا کو کھیل کے اس حصے کی مہارت نہیں تھی۔ اس نے اپنی شکست تسلیم کرلی۔

جنگ ختم کر کے اس نے ہیڈ فون مارٹا کو تھمایا تھا۔ تو مارٹا نے اسے اچنبھے سے دیکھا تھا۔ بیانکا عموماً" یا کم از کم دو گھنٹے تو ضرور ہی ٹیرس پر اپنی ڈیوٹی مکمل کرتی تھی۔

بیانکا نے مارٹا کے چہرے کے بدلتے تاثرات پر توجہ نہیں دی تھی۔ ڈانس فلور سے آتی ونس مور ونس مور کی صداؤں کو بھی اس نے نظر انداز کر دیا تھا اور نیچے اتر کر وہ شہرام زلاری کے بالکل مدمقابل آبیٹھی تھی۔

وہ یہاں اس کی اپالو دیوتا جیسی خوب صورتی کو سراہنے نہیں آئی تھی۔ وہ تو وجہ کھوجنے آئی تھی۔ خود پر فتح ہو جانے والی اس کی مجسم طبیعت کی۔ بار اسٹول پر بیٹھتے ساتھ ہی اس نے یہ کام پوری ایمان داری سے کرنا شروع کر دیا۔

اس ٹکڑے پر یقیناً" کچھ کندہ بھی تھا۔ لیکن فاصلے نے حد نظر کو محدود کر رکھا تھا۔ وہ چوکور ٹکڑا ایک کونے سے موٹی کالی ڈوری میں پرویا ہوا اس کی ہنسلی کی ہڈی کے جوڑ پر دھرا تھا اور وہ موٹی کالی ڈوری ایک متناسب اور خوب صورت گردن کے گرد ایسے لپٹی دکھتی تھی جیسے وہاں کوئی باریک کالا سانپ براجمان ہے اور سانپ کے اس آسن کے نیچے "ناگ منی" ہے۔

جو ایسا تھا تو غلط نہیں تھا۔ وہ... وہ واقعی ناگ منی تھا۔

وہ اورنج جوس کو کسی ایک خاص انداز سے پی رہا تھا اور جب جب وہ ٹھہرے ہوئے انداز سے گھونٹ بھرتا تو اس کی گردن کا کنٹھ نیچے آتے اور گم ہونے سے پہلے اس ٹکڑے کو چھونے کی ناتمام کوشش کرتا تھا۔

بیانکا نے رولنگ اسٹول کو موڑلیا اور وہ مزید براہ راست ہو گئی۔

اس کی شیو نا اسٹائل کے بڑھی ہوئی تھی اور سات آٹھ دنوں کی بڑھی شیو کے بال اس کے سرخی مائل گالوں کے نیچے کان کی لو کے قریب دو دائرے بناتے تھے 'بیانکا نے ان دائروں کو کھوجا اور خود کہیں کھو کر رہ گئی۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسے یاد آیا تھا کہ وہ ایسے ہی پرکشش دائروں کو پہلے کہاں دیکھ چکی ہے۔ وہ ان دائروں کو بچپن سے دیکھتی چلی آرہی تھی اور ساری زندگی دیکھتے رہنے کی خواہش مند تھی۔

وہ اس کے ڈیڈ الیاس کے گالوں پر پڑتے تھے۔

اور ڈیڈ الیاس کو یاد کر کے بیانکا کا دل کیا کہ وہ اس انجان لڑکے سے اجنبی نہ رہے "اس کے ارادے اور

سوچ میں شہرام کی جامد خاموشی حائل تھی۔ جو بار اسٹول پر بیٹھا اس قدر ٹھہراؤ اور طوالت کا شکار تھا کہ اس حالت میں وہ بیانکا کو اگستے روڈن Rodin) (Auguste کے مجسمے The thinker (سوچنے والا) لگا جس میں قدرت نے وقتی طور پر لمحوں کی جان ڈال دی ہو اور مجسمہ اس لمحے کی جان کو طول دے رہا ہو۔ وہ ٹیوب گلاس میں مشروب پی رہا تھا اور گلاس کے اندر کا سیال کسی جیلی کی طرح جما ہوا محسوس ہوتا تھا۔

کلب کا دستور تھا کہ مارگریٹ، مارٹینی اور کاک ٹیل گلاسز کے اسٹینڈ میں چارمز (charms) کی لڑی والا چھلا ڈالتے تھے۔ چارمز کرسٹل کے ہوتے تھے اور ان پر Power of love (محبت کی طاقت) کی مہر کندہ ہوتی تھی۔ ہلانے جلانے پر یہ چارمز بڑی دلکش جھنکار پیدا کرتے تھے۔

بیانکا سوچنے لگی کہ کلب انتظامیہ اگر کسی طرح ٹیوب گلاس میں چارمز والا چھلا ڈالنے میں کامیاب ہو بھی گئی تو اس لڑکے کی ہاتھوں کی جنبش کرم کے باعث ان چارمز نے جھنکار تو دور حرکت بھی نہیں کرنی تھی۔

کلب کی ایک اور روایت بھی تھی کہ کلب میں داخلے کے وقت ہر ایک کو کالی روشنائی والی Power of love کی مہر اپنے جسم پر کہیں بھی لگوانی پڑتی تھی، بیانکا کو آج تک اس روایت سے اختلاف نہ ہوا تھا۔ اکثر کلبوں کے ایسے ہی الٹے سیدھے رواج تھے۔ لیکن شہرام کی کلائی پر کالی روشنائی والی مہر دیکھ کر بیانکا کو ناگواری کا احساس ہوا اور ساتھ ہی اسے داخلی دروازے پر کھڑے کسی سانڈ جتنے تنومند حبشیوں کی بینائی پر بھی شبہ ہوا۔

اس لڑکے کو یہ مہر لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ دیکھ نہ سکتے تھے کہ یہ تو خود سراپا طاقت محبت ہے۔

"سنو!" بہت سوچ کر بیانکا نے اسے پکارا تھا۔ جسے شہرام شاید سن ہی نہیں پایا تھا۔

"تو بس صرف اتنی سی وجہ تھی۔" بیانکا کو اپنی سوچ پر شرمندگی ہوئی اور شہرام کے قوت سماعت سے محروم ہونے پر دکھ بھی... وہ پرے ہو گئی... اور مطمئن بھی۔

قریب بیٹھا شہرام بیانکا کی نظروں کی تاب سے دور ہو گیا... وہ پہلے بھی دور ہی تھا بہت دور اس کی سوچ کے دھاگے البانیہ کی سرزمین میں گڑے تھے اور ان دھاگوں میں وہ الجھتا جا رہا تھا۔

بابا ذلاری نے کہا تھا۔

"ادھورا علم اور کند چھری... دونوں ایک سا تڑپاتے ہیں۔"

"آپ یہ کیوں نہ سمجھ سکے بابا کہ ادھورا راز اور پشت کا وار بھی صیقل ہوئے خنجر سے کم خطرناک نہیں ہوتا۔"

دفعتاً" شہرام کو ٹھوکر لگی۔ اپنی ہر سوچ کے دھاگوں سے وہ بھول گیا کہ یہاں کوئی اس کے دوست طامیر جیسا نہیں ہے۔ جس نے البانیہ میں اسے ٹرک کی زد میں آنے سے بچا لیا تھا۔

بے بس غصے اور آپے سے بڑھتے رنج کی ایک لہر اس کے سینے سے اٹھی، اور اس کے ست دماغ پر آکر حاوی ہو گئی۔ ٹیوب گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے ہی قدموں میں گر کر چور چور ہو گیا۔

وہ اپنے حواس میں نہیں تھا، ورنہ یقیناً" اس چھناکے کی آواز پر ہی ضرور چونکتا... اپنے ڈولتے جسم کو سنبھالنے کے لیے اس نے ایک آخری بار کوشش کی تھی اور ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر بار ٹینڈر کی طرف اور ایک بیانکا کی طرف بڑھایا تھا۔ دونوں کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی وہ بلوری فرش پر بیانکا کے قدموں میں گر کر ڈھیر ہو گیا تھا۔

ایک ویٹر جلدی سے ہاتھ میں پکڑا تھال بار کی سطح پر رکھ کر شہرام کی طرف بڑھا تھا۔

اور حیرت سے جامد ہوئی بیانکا سوچنے لگی تھی۔

"کیا اورنج جوس پینے سے بھی کسی پر مدہوشی طاری ہو جاتی ہے۔"



اپنے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں کسی قدر تیزی سے چڑھ کر اور دروازے کو تقریباً" دھکیلتے ہوئے وہ اندر

داخل ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے آج وہ خلاف عادت دوسرے کمرے میں گئی تھی۔ جہاں ٹیپ لگے ایک دوجے کے اوپر تلے رکھے بہت سے بند کارٹنز میں اس کے پرانے گھر کا سامان پڑا ہوا تھا۔

جب سے وہ اپارٹمنٹ میں منتقل ہوئی تھی، اس کمرے میں آنے اور اس پرانے سامان کو استعمال کرنے کی اسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج جیسے اس کے سینے میں کسی نے دہکتی ہوئی سلاخ اتار دی تھی۔

ایک کارٹن پر سے ٹیپ کو کھینچ کر اتارتے ہوئے وہ اندر موجود چیزوں کو باہر نکال نکال کر فرش پر ڈھیر بنانے لگی تھی۔ دیکھتے دیکھتے سارا کارٹن تقریباً" خالی ہو گیا۔ وہ دوسرے کارٹن کی طرف بڑھی۔ پھر تیسرے کی طرف۔۔۔

چوتھا کارٹن کھولنے سے پہلے تک کمرے کا سارا فرش مختلف چیزوں سے ڈھک چکا تھا اور اس برق رفتاری سے یہ کام سرانجام دیتے دیتے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ تب کہیں جا کر اسے اپنی مطلوبہ چیز ملی تھی۔۔۔ تصویروں کا البم۔

کاؤچ پر بیٹھ کر وہ ایک ایک تصویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگی تھی۔ جیسے اپنی زندگی میں پہلی بار ان چہروں کو دیکھ رہی ہو۔ آنسو اس کے اندر ہی اندر کہیں دفن ہونے لگے تھے۔

فوٹو البم میں ان گنت تصویریں ایسی تھیں جن میں ڈیڈ الیاس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، لیکن بالوں کے وہ دائرے۔۔۔ وہ دلکش دائرے شاید کیمرے کا عدسہ فوکس نہیں کر سکا تھا۔

بیانکا نے خود کو پھر سے یاد دلایا کہ اسے رونا نہیں ہے۔۔۔ وہ جتنا رو سکتی تھی۔ بہت پہلے رو چکی تھی۔۔۔ اب اسے صرف ایک آخری بار رونا تھا۔۔۔ اور وہ وقت ابھی دور تھا۔

اسی وقت کے لیے وہ دن رات منصوبے بنا رہی تھی۔



بیانکا کی موجودہ زندگی کی کتاب میں سے اگر کلب کی ہنگامہ خیز جاب کے صفحے کو پھاڑ کر پھینک دیا جاتا تو یہ زندگی ایک بوڑھی کٹھور بیوہ کی سی زندگی تھی۔ ایسی بوڑھی بیوہ جس کے پانچ جوان بیٹے پانچ مختلف براعظموں میں رہائش پذیر ہوں اور وہ روز بلاناغہ گھر سجا کر ان کی آمد کا انتظار کرتی ہو۔

انتظار جو دل کی بے قراری اور آس سے جنم لیتا ہے۔ طویل ہو جائے تو آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور طویل تر ہو جائے تو دل چٹان بن جاتا ہے۔

وہ پچھلے آٹھ ماہ سے انتظار کی اس چوکھٹ میں کھڑی تھی جس میں دل کی حرکت ہر بار دق کے مریض کی طرح خطرے کی گھنٹی بجاتی تھی۔ پیچھے جانا اسے منظور نہیں تھا اور آگے کے تمام راستے اندھے کنوئیں کو جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس نے خود کو زندہ رکھنے کی ہر کوشش پر عمل کیا اور اس کوشش نے اسے اندر تک سے توڑ دیا۔ اس طرح کہ دنیا کا کوئی واقعہ اب اسے حیران نہیں کرتا تھا۔

کل رات بڑے عرصے بعد اس نے بلوری فرش پر لڑکھڑا کر گرتے شہرام کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کیا تھا اور اسے خود پر حیرت ہوئی تھی۔ اگر سب اسی طرح معمول پر آتا رہا تو پھر اس کی بربادی کا نظارہ ایسا ہی ہونے والا تھا جیسے روم کے جلنے کا۔۔۔

شام میں وہ سارے خیالات جھٹک کر کلب گئی تھی تو اتفاقیہ طور پر ڈینیل اور جوڈتھ بھی اس لڑکے (شہرام) کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔

"اس کے دائیں بازو کی ہڈی میں بہت زیادہ فریکچر آیا ہے۔"

ڈینیل خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنی "بو" درست کر رہا تھا۔ دوسرے آئینے کے سامنے کھڑا جوڈتھ اپنی گردن پر بنے "بیوٹی اینڈ دی بیسٹ" کے ٹیٹوز کو رنگنے میں مصروف تھا۔ وہ ہر روز یہ عمل بڑے شوق سے پورا کرتا تھا۔ اس کا خیال نہیں بلکہ یقین تھا

کہ یہ چیز اس کی بیوٹی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ جبکہ حقیقت میں لوگ اسے دیکھ کر سوچتے تھے کہ یہ شخص دن بدن بیسٹ (درندہ) کیوں بنتا جا رہا ہے۔

دونوں کی گفتگو کو غیر دانستہ سنتے اپنے ہونٹوں پر اورنج رنگ کی لپ اسٹک لگاتی بیانکا کے ہاتھ نجانے کیوں خود بخود رک گئے تھے۔

"اس کی جیب سے کوئی آئی ڈی، وزیٹنگ کارڈ یا ایڈریس نہیں ملا۔۔۔ اس کا پرس بھی تقریباً" خالی تھا اور اس کے پاس سیل فون بھی نہیں تھا۔ گرین روم میں پڑے اس کے سفری بیگ میں بھی پاسپورٹ اور چند معمولی کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔"

"حیرت ہے۔۔۔ کیا وہ ایئرپورٹ سے سیدھا کلب ہی آ رہا تھا۔" جوڈتھ گردن کو آتشی رنگ میں پینٹ کرنے کے بعد جھک کر شوز کے تسمے کسنے لگا تھا۔

"اور منحوس منیجر کہنے لگا کہ میں صلہ رحمی کے تحت ہسپتال جا کر اس کے لیے فنڈ سے علاج کا فارم فل کر دوں۔۔۔"

"بدبخت شخص اگر اسے انسانی ہمدردی کا اتنا ہی بخار چڑھا رہتا ہے تو وہ خود کیوں نہ چلا گیا۔۔۔ ہماری ٹپ میں سے بھی دسواں حصہ فضول میں ہی کھرا کر لیتا ہے۔"

جوڈتھ کو منیجر کے اگلے پچھلے سارے غصے یاد آ گئے تھے۔

"وہ کس ہسپتال میں ہے۔۔۔؟" مڑ کر بیانکا نے بلا سوچے سمجھے پوچھنا چاہا تھا۔

ڈینئل اور جوڈتھ وہاں سے جا چکے تھے، ورنہ وہ واقعی یہ سوال پوچھ ڈالتی۔

"مجھے اس سارے معاملے سے کیا سروکار۔۔۔؟"

لپ اسٹک لگانے کے رکے ہوئے عمل کو پورا کرتے ہوئے وہ ٹیرس کی طرف بڑھی تھی۔ مارٹا نے اس کی آمد کا اعلان کر دیا تھا۔



رامش گر ہوا میں بڑے بھید بھرے گیت قید تھے۔

وہ خود جو سنگیت کی ماہر تھی ہوا کے ان پرنور گیتوں کے آگے اس نے دنیا کے تمام نغموں، گیتوں، الاپوں اور برہوں کو بے ضرر اور بے اثر جانا۔۔۔

سرسوں کے پھولوں سے رنگی ہوئی صبح درختوں پر جھکتی چلی آتی تھی اور سونے رنگ کا پارہ گہرا ہوتے ہوتے ہر سو بکھرنے لگا تھا۔

اس نے ٹھنڈی اوس کی نمی والی راحت کو اپنے پیروں کے نیچے رفتہ رفتہ گم ہوتے ہوئے محسوس کیا اور قریب پڑے جوتوں کو واپس پہن لیا۔

وہ کافی دیر سے یہاں موجود تھی۔ آج صبح اٹھتے ساتھ ہی وہ اس پارک میں چلی آئی تھی۔ تب جوگنگ کرنے والوں کا بہت رش تھا۔ لیکن پھر جوں جوں دن چڑھنے لگا رش بھی کم ہوتا گیا۔

جوتے پہن لینے کے بعد وہ تھوڑی دیر مصنوعی جھیل کی ناسپاس لہروں میں سرائیت کرتی سورج کی شعاعوں کو دیکھتی رہی تھی۔ دھوپ روز والا جوبن حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

چمکیلی دھوپ کے سحر کو اپنی باہیں کھول کر اس نے اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا اور ایک بار پھر اللہ سے اپنی کامیابی کے لیے دعا مانگی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اسی حالت میں رہی۔ آج بڑے دنوں کے بعد اس نے خود کو خوش کرنے کے لیے وقت نکالا تھا۔

"آرائشی پیاز" کی جامنی باڑ کو کسی تتلی کی طرح چھوتے ہوئے وہ واپسی کے لیے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔۔۔ جب اس کی نظر مخالف سمت میں بنی کینٹین کے کاؤنٹر پر اسے کھڑے دیکھ کر دوبارہ پیچھے پلٹی تھی۔

اس کی نظر رکی تو وہ خود بھی محو سفر نہ رہ سکی۔

وہ بلاشک و شبہ وہ ہی تھا۔ جس کے سرہانے وہ ایک ہفتہ پہلے وائلٹ للی کا گلدستہ رکھ آئی تھی۔

اس دن سے پچھلی رات اس نے ٹیرس سے اتر کر ڈینئل کو تقریباً" جھنجھوڑ ہی ڈالا تھا۔

"اس ہسپتال کا نام کیا ہے۔ جس میں وہ لڑکا ایڈمٹ ہے؟" ڈینئل کے تھال میں چھ جام پڑے ہوئے تھے اور بیانکا کے اس بری طرح اسے ہلانے سے وہ چھ کے

چھ جام چھلکے تھے۔

"کون سا لڑکا۔۔۔؟" خود کو کسی حد تک غصے کی حالت میں ظاہر کرتے ہوئے ڈینئل نے بھونچکا ہو کر پوچھا تھا۔

"جو کل رات یہاں پر گر گیا تھا۔۔۔"

بیانکا نے بار اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ اسے ڈینیل کے تاثرات کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی۔ ڈینیل نے اسے ہسپتال کا نام بتا دیا تھا۔

اگلے دن وہ صبح جلدی اٹھ کر ہسپتال گئی تھی۔ شہرام کو تلاش کرنے میں اسے چند منٹ ہی لگے تھے۔ اگرچہ اس کا نام بھی اسے یہاں آکر ہی معلوم ہوا تھا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اپنے یہاں آنے کی جھوٹی سچی وجوہات گھڑتے ہوئے الفاظ کو ترتیب دینے لگی تھی، لیکن اسے کچھ بھی بولنا نہیں پڑا تھا۔ شہرام میٹھی اور گہری نیند سو رہا تھا۔ اس طرح کے اس کی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے بیانکا کو اپنے دل پر خون کی گردش تیز تر ہوتی محسوس ہوئی۔

اس کے سرہانے کے پاس وہ واٹرللی کے پھولوں کا ایک چھوٹا گلدستہ رکھ کر باہر آگئی تھی۔

"مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔۔۔ نجانے کیوں بعض اوقات میں بہت بے وقوفی والی حرکتیں کرتی ہوں۔۔۔" باہر نکل کر وہ سوچنے لگی تھی۔

ایک ہفتہ وہ نہ چاہتے ہوئے کلب میں اس کی آمد کا انتظار کرتی رہی تھی۔ کل رات ہی وہ اس انتظار سے کچھ غافل ہوئی تھی اور کل رات ہی اسے پتا چلا تھا کہ شہرام گرین روم سے اپنا شولڈر سفری بیگ لے کر جا چکا ہے۔ جس میں اس کے پاسپورٹ کے علاوہ چند کپڑے بھی موجود تھے۔

اور آج وہ اسے پھر نظر آگیا تھا۔ بلو جینز اور وائٹ ہاف بازو کی ٹی شرٹ میں۔۔۔ ایسے کہ اس کا دایاں ہاتھ مکمل طور پر سفید پٹیوں سے کسا ہوا تھا۔ اپنے قدموں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لیے بیانکا نے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔

اس کا دایاں بازو ساکن تھا اور بائیں ہاتھ سے وہ اپنی ہپ پاکٹ میں سے شاید والٹ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ہاٹ ڈاگ اس کے ہاتھ میں تھا اور دکان دار اس کی اس دیر پر بڑی کوفت کا شکار لگ رہا تھا۔

"اس میں سے ان کے ہاٹ ڈاگ کے پیسے کاٹ لیں۔"

بیانکا نے اپنے پرس میں سے پیسے نکال کر دکان دار کی طرف بڑھائے تھے۔

یک لخت شہرام نے گردن اٹھا کر بیانکا کی طرف دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں پہچان کی ہلکی سی چمک آکر گزر گئی تھی۔

"نہیں، میں پیسے خود ادا کر سکتا ہوں۔" وہ گویا ہوا اور حیرت سے بیانکا کی آنکھیں پھیل گئیں۔۔۔ تو وہ سن سکتا تھا۔۔۔ اور بول بھی سکتا تھا۔۔۔ ایک انجانی خوشی کا احساس اس کے چہرے سے جھلکنے لگا۔

"تکلف میں مت پڑو۔۔۔ ہاٹ ڈاگ کی پرائس کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں ہے۔ میں نے پارک میں اکثر بوڑھوں کو اسے توڑ کر پرندوں کو کھلاتے دیکھا ہے۔" بقایا پیسے لے کر وہ اپنے پرس میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"تمہارا بازو اب کیسا ہے۔۔۔ مجھے افسوس رہے گا کہ میں تمہیں بروقت سہارا نہ دے سکی" قریبی بینچ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا اور بتایا بھی تھا۔

"یہ بہتر ہے۔۔۔"

وہ مسلسل بائیں ہاتھ سے اپنی ہپ پاکٹ کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ بینچ تک پہنچنے پر وہ اپنا والٹ نکالنے میں کامیاب ہو گیا تو بیانکا اور اپنے درمیان اس نے اس والٹ کو رکھ دیا تھا۔

"میں نے کہا نا اس کی ضرورت نہیں۔" بیانکا نے والٹ کو دوبارہ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"تمہیں اتنی جلدی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ میرا نہیں خیال کہ یہ اتنا ہی بہتر ہو گیا ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔۔۔ کیا تمہاری فیملی میں سے کسی نے تمہیں اس طرح باہر نکلنے سے نہیں روکا۔" وہ خود کو ہر بات سے لاعلم ظاہر کرنے لگی۔

شہرام چند لمحے خاموش رہا تھا۔
"میں یہاں پر اکیلا ہوں....."
وہ زیادہ حیران نہیں ہوئی' ایک تو اس وجہ سے کہ وہ ہر بات پہلے سے جانتی تھی اور دوسرا اس وجہ سے کہ وہ خود اکیلی تھی۔
"ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ پر اکیلے ہیں.... پھر بھی اپنا خیال ہمیں کسی کی نصیحت کے بغیر بھی رکھنا چاہیے۔"
کچھ توقف اور ایک طرح کا فیصلہ کر لینے کے بعد اس نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا تھا۔
"نرس نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں ٹھیک ہونے میں کم از کم ایک ماہ لگے گا۔"
وہ بات جسے وہ خود سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتی تھی وہ بات اس کی نوک زبان سے انجانے میں نہیں پھسلی تھی۔ بلکہ وہ خود اس بات کو بتا دینا چاہتی تھی۔
شہرام چونکا تھا... اور پھر دوبارہ اپنے قدموں تلے کی زمردی گھاس کو دیکھنے لگا تھا۔
اس کی جھکی آنکھوں میں "بدھا" کی بند آنکھوں کے اسرار و کشف کی الوہیت تھی۔
"پھولوں کا شکریہ....."
بڑی دیر بعد اس نے کہا تو بیانکا کو اس کی آواز زمین کے کسی دوسرے خطے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
"ایک بات پوچھوں... ویسے اگر تم اجازت نہیں بھی دو گے میں تب بھی پوچھ ہی لوں گی... تم اس دن ڈرنک تو نہیں... تھے.... تو پھر...؟"
ریپر ہٹا کر ہاٹ ڈاگ گھماتے شہرام نے رک کر ایک گہرا سانس لیا تھا۔
"اس دن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"
وہ بات کو ختم کرنے کے انداز میں بولا تھا۔
بیانکا نے واضح طور پر نوٹ کیا کہ وہ ہاٹ ڈاگ کو ایسے کھا رہا تھا جیسے یا تو اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا یا پھر وہ آج سارا دن اسی ہاٹ ڈاگ پر گزارہ کرنے والا تھا۔
اپنے اور اس کے درمیان میں پڑے ہوئے اس نے اس کے والٹ کو دیکھا تھا۔ جس کی بیرونی حالت اندر کے کل اثاثے کی غماز تھی۔ وہ یقیناً" سارا دن اسی ہاٹ ڈاگ پر گزارہ کرنے والا تھا۔
خاموش بیٹھا جیسے وہ مزید گفتگو کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اور بیانکا اس تجسس کو اپنے ساتھ گھر لے کر جانا نہیں چاہتی تھی۔
"ڈینئیل نے بتایا کہ تمہارے پاس کوئی سیل فون' کارڈ' ایڈریس وغیرہ بھی برآمد نہیں ہوا۔ کیا تم اس ملک میں بالکل ہی نئے آئے ہو۔ کیا تمہارا یہاں کوئی نہیں ہے یا وہ اب تمہیں ایکسیپٹ نہیں کر رہے۔ جیسا کہ یہاں اکثر ایشیائیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمہاری رہائش کہاں ہے...؟"
اس کے لیے اس میں سے کسی ایک سوال کا جواب بھی بہت تھا۔
شہرام ہاٹ ڈاگ کھانا جیسے بھول گیا اور بیانکا کی طرف دیکھتے ہوئے وہ قدرے تیز آواز میں بولا تھا۔
"آخر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو....؟"
یہ تیز آواز کسی پرندے کی چہکار سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ براہ راست بیانکا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ لمحے بھر میں وہ لاتعلقی کی تصویر بن گیا۔
بیانکا نے اس سوال اور اس انداز کو اپنی بے عزتی محسوس کیا اور اپنے دماغ کو سنسناتے ہوئے پایا۔ وہ ایک ٹک شہرام کے چہرے کے پیچھے آئے جوبن چڑھے سورج کو دیکھنے لگی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی یا کچھ اور... اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔
پھر وہ ایک جھٹکے سے بینچ سے اٹھ کر گھومی تھی۔
بیانکا کے اس طرح اٹھنے سے شہرام کو احساس ہوا تھا کہ اس نے بلاوجہ تلخی بھرا رویہ اپنایا... قصور اس کا تو نہیں تھا۔
"غلطی میری ہے... میرا دماغ ازل سے ہی خراب ہے...." بینچ کے پیچھے کی کالی اینٹوں والی روش پر آتے ہوئے بیانکا نے خود سے کہا تھا اور تیز تیز چلنے لگی تھی۔
"میں البانیہ سے ہوں۔" اپنی پشت پر اسے خوب صورت پرندے کی گونج دار آواز سنائی دی تھی اور اس کے قدم رک گئے تھے... نہ چاہتے ہوئے بھی۔

"Princeton یونیورسٹی (نیو جرسی) کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ لیکن اب میں نیو جرسی جانا نہیں چاہتا۔۔۔ اصل میں میں اب کہیں بھی جانا نہیں چاہتا۔۔۔ اس شہر میں میری کوئی رہائش نہیں ہے اور میں کوئی رہائش رکھنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا۔۔۔ رات کو یہ بینچ ہی میرے لیے بستر کا کام کرتا ہے اور یہ پارک میرا ابدی گھر ہے۔۔۔"

وہ اس کے سارے سوالوں کے جواب دے کر خاموش ہو گیا تھا اور بیانکا روش کی سیدھ میں نصب باغ کے آہنی جنگلوں والے وکٹورین طرز کے بنے ہوئے بڑے گیٹ کو دیکھنے لگی تھی۔

فضا میں کچھ طباشیر کی بو پھیلی تھی۔ سادھو صفت گلابی راج ہنسوں کا غول ندی کے پانی کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے لگا تھا۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے اڑتے ندی کے باسی پانی کے چھینٹے ہوا کی روش پر سوار ہو کر بیانکا کو شرابور اور سرشار کرنے لگے تھے۔۔۔ (روش کے اطراف سیدھ میں آگے دور تک گئے چیری کے درختوں پر جیسے ایک دم سے بہار آگئی تھی۔ اور سارے درخت گلابی رنگ کے پھولوں سے ڈھک گئے تھے۔

بیانکا نے گھر جانا تھا۔ اسے تیاری کرنی تھی۔ پھر ایئرپورٹ کے لیے نکلنا تھا۔۔۔ اور اس کے پیچھے وہ خوش مزاج شہزادہ بیٹھا تھا جو شاید اپنا سب ہی کچھ لٹا چکا تھا۔

اسے یاد آیا حیفہ مام کوئی بھی اہم کام کرنے سے پہلے کسی کی مدد کرنے کے عقیدے پر بہت سختی سے کاربند رہا کرتی تھیں۔

"میرے ساتھ چلو گے۔۔۔؟" پلٹ کر بیانکا نے پوچھا تھا۔

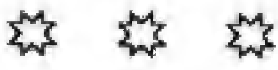
"کہاں۔۔۔؟" توقف کے بعد وہ چوبی بینچ کے تختے پر ٹھوڑی رکھے حیرت سے گویا ہوا۔

"گھبراؤ نہیں۔۔۔ تمہیں اغوا نہیں کروں گی۔۔۔" وہ مسکرائی۔

"البانیہ سے تاوان دینے بھلا آئے گا بھی کون۔۔۔"

اور اب کے وہ بے اختیار ہنسی تو ایک لمحے کے لیے شہرام کے ہونٹوں کے کونوں میں بھی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی تھی اور اس مسکراہٹ میں ققنس (ایک پرندہ جس کی چونچ سے 320 سر نکلتے ہیں) کے سارے سر شامل تھے۔

بیانکا اس کے لیے وہ ہی کر رہی تھی جو کسی وقت میں رچرڈ ہاؤس کے بوڑھے رابن اور اس کی بیوی نے اس کے لیے کیا تھا۔



وہ ایک ماہ شکاگو میں رہی تھی۔

اسپیڈ اجوف یانی وانسز کا شاگرد تھا اور انتہائی قابل بھی۔

اس سے میش اپ (مختلف گانوں کے ردھم سے تیار کیا گیا گانا) تیار کروانے کے لیے بیانکا نے اپنی باقی ماندہ دولت بھی خرچ کر ڈالی تھی اور فیصلہ قسمت اور وقت کے سپرد کر دیا تھا۔ ان دنوں وہ تقدیر کے پل صراط پر چل رہی تھی اور یہ پل صراط اسے ہر صورت طے کرنا تھا۔ تاہم کامیابی تک پہنچنے کے ممکنہ خدشوں کے باعث ابھی یہ نتیجہ زیادہ واضح نہیں تھا کہ اس نے اپنی باقی ماندہ دولت بہتر جگہ پر خرچ کی ہے یا آگ میں جھونک دی ہے۔

کچھ اس کی پچھلی آٹھ ماہ کی جاب کی مہارت تھی۔ کچھ اس مہارت پر ملنے والے کمنٹس اور کچھ اسپیڈ اجوف کی بڑھتی ہوئی شہرت' وہ قدرے مطمئن تھی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو لے کر پرامید بھی۔۔۔

اس کے خیال میں میش اپ کے لیے 2014ء کے جن پانچ گانوں کا انتخاب اس نے کیا تھا اس کے بارے میں امریکہ کا کوئی ڈی جے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے سولو اور سیڈ گانوں کا انتخاب کیا تھا۔ اپنی جاب کے دوران بھی وہ زیادہ تر افسردہ گانے چلانے میں ہی مہارت رکھتی تھی۔ پھر اس نے لبنانی سازوں کی نئی اور پرانی دھنوں کو بھی چنا تھا۔

اسپیڈ اجوف کو اس کے سارے انتخاب پر اختلاف تھا۔

"ہر چیز میں افسردگی کا رنگ غالب ہے۔۔۔ میں اس

کے ساتھ ایسا کیا کروں کہ سب ناچنے پر مجبور ہو جائیں ـــ۔"

"تم اس بات کی فکر نہ کرو۔۔۔ یہ میرا آٹھ ماہ کا تجربہ ہے۔"

"اور میرا دس سالہ۔۔۔ گیت کو بہت زیادہ دھیما کر بھی دیا گیا تو اصل روح تو وہ ہی رہے گی۔"

اسپیڈا جوف کی بات میں دم اور تجربہ تھا۔۔۔ لیکن بیانکا کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"دھنوں کے حوالے سے تم جو چاہے کر سکتے ہو۔۔۔ لیکن گانے یہ ہی رہیں گے۔" اس نے دو ٹوک اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ایک ماہ لگاتار اس میش اپ پر کام ہوتا رہا تھا۔ وہ سازوں کے بارے میں اسپیڈا جوف سے زیادہ نہیں جانتی تھی۔ پھر بھی وہ تقریباً" ہر روز اس کے اسٹوڈیو میں پہنچ جاتی تھی۔ تاہم یہ اس کی مہربانی ہوتی تھی کہ وہ صرف رائے ہی دیتی تھی۔۔۔ مداخلت نہیں کرتی تھی۔

میش اپ تیار ہو چکا تھا۔ صرف ویڈیو مکسنگ کا کام ہو رہا تھا۔ بیانکا اسے کلب کی اینیورسری پر ریلیز کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

ساتھ ساتھ اس کی نظر ان جھتوں پر بھی تھی کہ میش اپ اعلیٰ سے اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو' وہ ایک دم سے شہرت کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا۔ ایسا کسی سنگر کے ساتھ تو ہو سکتا ہے لیکن کسی ڈی جے کے ساتھ نہیں۔

ہاں البتہ یہ ضرور تھا کہ کوئی میوزک کمپنی اسے بڑی آفر کر سکتی تھی۔ کسی بڑے سیون اسٹار ہوٹل کے کلب میں جگہ پانے میں آسانی ہو سکتی تھی۔ یا وہ سیول ورلڈ ڈی جے فیسٹول میں جانے کی لمبی لائن میں کھڑے ہونے کے لیے اپنے پاس ایک ٹکٹ رکھتی تھی۔

اس کے اب تک پیچھے رہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ دوسری ڈی جے لڑکیوں کی طرح جھومتی ناچتی نہیں تھی۔ ایسے غیر اخلاقی کام کی سوچ بھی اس کی تربیت میں شامل نہیں تھی۔ مارٹا میں کسی حد تک دوسری ڈی جے لڑکیوں کے سے اثرات پائے جاتے تھے لیکن بیانکا نے جاب اسی شرط پر کی تھی وہ صرف میوزک چلائے گی۔۔۔ اپنی جگہ ساکت رہ کر۔۔۔ کلب انتظامیہ اس سے دوسری ڈی جے لڑکیوں کی طرح کا رویہ اپنانے کا مطالبہ نہیں کرے گی۔

کلب بہت زیادہ معروف نہیں تھا اور بیانکا کی شرائط بھی ایسی نامعقول نہیں تھیں۔

اس کے ان سخت اصولوں کے باوجود بھی اسے ادھر ادھر سے چھوٹی بڑی آفرز تو آتی ہی رہتی تھیں۔۔۔ کسی ہوٹل یا کلب کی۔۔۔ اور جن کو سن کر مارٹا اپنے چہرے کے بدلتے رنگوں پر قدرت نہ رکھ پائی تھی۔

"تم چاہتی کیا ہو بیانکا۔۔۔ آخر تم اس آفر کو قبول کیوں نہیں کر لیتیں۔۔۔ وہ تمہیں یہاں کی نسبت دوگنی تنخواہ دے رہے ہیں۔"

"مجھے ایک ہی بار میں بڑی چھلانگ لگانی ہے مارٹا ۔۔۔ تیراکی میں بٹو فلائی طریقہ مجھے شروع سے ہی ناپسند رہا ہے۔ انسان جلدی تھک جاتا ہے۔ مجھے ڈائیونگ (Diving) کا شوق ہے۔۔۔ اونچی ڈائیونگ کا۔۔۔ سمر سلٹ کا۔۔۔ اور اس کا ابھی وقت نہیں آیا۔" مارٹا اس کی باتیں سن کر لاجواب ہو جاتی تھی۔

اور اب شاید وقت آ گیا تھا بڑی چھلانگ لگانے کا۔

اس بڑی چھلانگ کی متوقع خوشی کو وہ کسی کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ کسی کو اپنی بے تابی کا رازدار بنانا چاہتی تھی۔ کوئی ایک ایسا جو اسے بالکل اپنا لگے اور آنے والے وقت کے سہانے خواب اس کی آنکھوں میں پڑھ لے۔

تب وہ نہیں جانتی تھی کہ پڑھنے والا کوئی اور تحریر پڑھ لے گا اور بتانے والا بھی کچھ اور بتا دے گا۔

پتا نہیں یہ وجوہات اس کے ذہن میں تھیں یا شہرام کا نام یاد آتے ہی اس نے ان بہانوں کو گھڑ لیا تھا جو کچھ بھی تھا۔ آج وہ بلا ارادہ اوک بلڈنگ تک نہیں جا رہی تھی۔ جہاں کے ایک نیم اندھیرے کمرے میں شہرام رہتا تھا۔

شنگا گو جانے سے پہلے وہ اسی نیک کام کو کر کے گئی

تھی۔ اس نے ایک ماہ کا ایڈوانس کرایہ دیا تھا جس میں دو وقت کے کھانے کے چارجز بھی شامل تھے۔

"جب تم حالات کو اپنے لیے بہتر کر پاؤ تو ان پیسوں کو لوٹا دینا۔ نہ بھی دو گے تو کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ وہ بہت زیادہ پرجوش ہو رہی تھی۔

اس ایک ماہ کی غیر حاضری کے دوران اسے ٹوٹ کر یہ احساس ہوا تھا کہ شہرام کے پاس ایک سیل فون تو ہونا ہی چاہیے۔۔۔ وہ میک اپ کی تیاری کے سلسلے کی ہر بات اسے بتانا چاہتی تھی۔

"نجانے وہ اب تک اس بلڈنگ میں رہائش پذیر ہو گا یا کہیں اور جا چکا ہو گا۔" بیانکا کو یہ سوچ کر ایک خوف سا محسوس ہوا تھا۔

ٹیکسی بڑی سڑکوں کو ناپنے لگی تھی اور بیانکا کی نظریں افق کی دھار پر ٹکی ہوئی تھیں۔

دور۔۔۔ اوک بلڈنگ کے نیم اندھیرے کمرے میں بیٹھا ہوا شہرام بھی اسی طرح کی لایعنی سوچوں میں غرق تھا۔

"اس کمرے میں تو کوئی روزن بھی نہیں ہے۔۔۔ اور وہ لڑکی مجھے یہاں داخل کروا کر خود نجانے کہاں جا چھپی ہے۔"

وہ دو ایک بار شائن کلب بھی گیا تھا جہاں سے اسے صرف یہ ہی پتا چل سکا کہ بیانکا غیر معینہ مدت کے لیے کلب سے چھٹی لے چکی ہے۔

"تو کیا وہ لڑکی صرف ایک لمحے کی مدد تھی جو آیا اور چلا گیا۔"

وہ مایوسی سے سوچنے لگا تھا۔

دونوں نہیں جانتے تھے کہ دونوں آج ملیں گے تو ایک دوجے کو اپنے اپنے ماضی کی وہ پرتیں بھی دکھا دیں گے جن سے آپ ابھی تک لاعلم ہیں۔



مغرب کی طرف کا شہیدی رنگ آسمان کسی قتل کی واردات کی کہانی سناتا لگتا تھا۔

کھڑکی سے نظر آتی نیویارک شہر کی روشنیاں رفتہ رفتہ شباب کو پہنچنے والے جگنوؤں کی طرح دن ڈھلنے کے بیماری کے باعث گاڑھے ہوتے اندھیرے میں اپنی اپنی جگہ تلاش کر کے ٹمٹمانے لگی تھیں۔ دور سے یہ منظر کسی گڑھے میں پڑی پسی ہوئی چاندی کی طرح نظر آتا تھا۔

بیانکا نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے برابر کر دیے۔

حیفہ مام بڑی دیر سے باہر ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایسے کہ ان کی آنکھیں جیسے اسی رخ پتھرا گئی ہوں۔ بیانکا نے ایک دوبار انہیں ٹوکا بھی تھا لیکن وہ دوبارہ آنکھیں مسل کر باہر کے نظارے میں کھو جاتی تھیں۔ بیانکا کو ان کی اس حالت سے بڑا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے برابر کر دیے لیکن حیفہ موم کی نظریں نہیں پھری تھیں۔ وہ باہر دیکھ رہی ہوتیں تو چونکتیں۔

"آج ڈیڈی کو زیادہ دیر نہیں ہو گئی۔۔۔"

کارنس پر دھرے کرسٹل گلدان میں پڑے نقلی پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے اس نے مام سے کہا تھا۔۔۔ کسی حد تک خود سے۔۔۔

"دعا کرو انہیں صرف دیر ہی ہوئی ہو۔۔۔ دیر سے ہی سہی وہ آج گھر واپس آ جائیں۔" حیفہ مام نے رندھی ہوئی آواز سے کہا تو پھولوں کی ایک ڈنڈی بیانکا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے فرش پر گر گئی۔ وہ حیفہ مام کی بات سے زیادہ ان کی غلافی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کو دیکھ کر چونکی تھی۔ آج صبح سے ہی حیفہ مام کا انداز بہت عجیب اور نیا سا تھا۔ نمی نے ان کی آنکھوں کے کناروں کو اکیلا نہیں ہونے دیا تھا اور وہ ضرورت سے زیادہ خاموش تھیں۔۔۔ اور کئی گھنٹوں سے اسی کرسی پر بیٹھی تھیں۔

آج انہوں نے بیانکا کو تیز آواز میں میوزک سننے سے بھی منع نہیں کیا تھا۔ آج نہ ہی وہ اپنی دوستوں کے ساتھ گھر سے باہر گئیں اور نہ ہی ان کو اپنے گھر بلایا تھا۔

"مام۔۔۔ سب خیریت تو ہے ناں۔۔۔" وہ ایک بار پھر حیفہ موم کے قریب چلی آئی تھی۔

"خیریت۔۔۔؟" وہ افسردگی سے چونکیں۔ "اسی کے لیے تو دعا کر رہی ہوں۔" ایک خاکستری آنسو ان کی آنکھ سے بہہ کر گال تک آ گیا۔

"آپ نے کبھی ایسا رویہ نہیں اپنایا مام۔۔۔ آپ کبھی مجھے اتنی کمزور دل نہیں لگیں۔" فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا تھا۔ حیفہ مام اس کا سر سہلانے لگی تھیں۔

"کچھ واقعات زندگی میں پہلی بار ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں بیانکا۔۔۔" انہوں نے دونوں آنکھوں کو باری باری اپنی شال سے صاف کیا تھا۔

"آپ جذباتی ہو رہی ہیں مام۔۔۔ ڈیڈ آٹھ بجے تک آتے ہیں۔۔۔ اور ابھی صرف آدھا گھنٹہ ہی تو زیادہ ہوا ہے۔"

"نو بج جائیں۔۔۔ دس بج جائیں۔۔۔ رات گزر جائے۔۔۔ لیکن میرے دل کے خوف۔۔۔ خدا کرے بس یہ پورے نہ ہوں۔"

"آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں۔۔۔ میں ڈیڈ کا فون پھر ٹرائی کرتی ہوں۔۔۔ کسی وجہ سے ہی بند ہو گا۔۔۔ ورنہ تایا غفار کو کر لیتی ہوں۔۔۔ وہ بتا دیں گے کہ ڈیڈ وہاں سے کب نکلے تھے۔"

وہ اٹھنے لگی تو حیفہ موم نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے دوبارہ نیچے بٹھا دیا تھا۔

"خدا کے لیے یہ مت کرو بیانکا۔۔۔ کیا میں ایسا نہیں کر سکتی۔۔۔ میں اپنی دعاؤں کو اور وقت کو مزید مہلت دینا چاہتی ہوں۔۔۔ اگر فون تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا یا تمہاری آنکھوں کی پتلیاں ذرا سی بھی پھیلیں تو۔۔۔ تو میرا دل اسی وقت بند ہو جائے گا۔"

حیفہ موم نے لرزش زدہ آواز سے کہا اور پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔ بیانکا کا دل مٹھی میں آ گیا تھا۔

"ان سے پہلے ان کی خوشبو مجھ تک پہنچ جائے گی۔۔۔ جو آج۔۔۔ جو آج انہوں نے یہاں پہنچنا ہوا تو۔۔۔" وہ روتے ہوئے گویا ہوئیں تو بیانکا نے چہرہ اٹھا کر پتھرائی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔

تب ہی نجانے کہاں سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا تھا۔ جس کے انگ انگ میں کافور کی بو رچی بسی ہوئی تھی۔

الیاس کریم پچیس سال پہلے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں چھوٹی پوسٹ پر تعینات ہو کر پاکستان سے امریکہ آیا تھا۔ پاکستان کے شہر خانیوال میں اس کے خاندان میں دو بوڑھے ماں باپ ایک بڑے اور ایک چھوٹے بھائی کے علاوہ اس کی بچپن کی منگیتر شہناز بھی موجود تھی۔ شہناز الیاس کی چچا زاد تھی۔ جو چچا چچی کے انتقال کے بعد سے ان کے گھر ہی رہ رہی تھی۔ دونوں کی شادی دو سال بعد ہونا متوقع تھی۔ لیکن کون جانتا تھا کہ قسمت اور خود الیاس کریم کا منظور نظر کچھ اور ہی ہونے والا تھا۔

جس کمپنی میں الیاس کام کرتا تھا اسی کمپنی میں ایک سال پہلے حیفہ یازر بھی اپنی تعلیمی قابلیت اور ذہانت کی بنا پر ملازمت اختیار کیے ہوئے تھی۔

حیفہ یازر کا تعلق لبنان سے تھا۔ وہ بچپن سے ہی غربت اور بہت برے حالات میں پلی بڑھی تھی اور باپ کی وفات کے بعد ماں کو رشتے داروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آئی تھی۔

الیاس کریم سے یہ ساری باتیں کرنے تک۔۔۔ دونوں بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔

حیفہ نوجوان تھی۔۔۔ پرکشش بھی اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں بیشتر لبنانی لڑکیوں کی طرح قدرتی کاجل کی دہک نصب تھی۔ اور یہ قدرتی کاجل کی دہک وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الیاس کو دن کے علاوہ راتوں کو بھی پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ بھول گئے تھے کہ پاکستان میں ان کی نسبت شہناز سے طے ہے۔

حیفہ یازر کے متعلق سوچنے کی اخلاقی چوری نے رفتہ رفتہ الیاس کریم کا احساس جرم اتنا بڑھا دیا کہ پھر جلد ہی انہوں نے اس پریشانی کا مقابلہ کر لینے کی ٹھان لی۔

حیفہ یازر الیاس کے جذبات سے بہت دنوں تک غافل نہیں رہی۔ خود اس کے جذبات بھی کچھ اسی نوعیت کے تھے۔ لبنان میں بوڑھی ماں کی وفات کی خبر نے اسے مزید بے آسرا اور اکیلا کر دیا تھا۔ اس نے الیاس کو مشورہ دیا کہ وہ جلد ہی اپنے والدین کو دونوں کے فیصلے کے بارے میں آگاہ کریں۔

الیاس نے ایک دن ہمت کر کے اپنے والدین سے بات کی تھی اور انہیں حیفہ یازر کے متعلق بتایا تھا۔ اس بات چیت کا جو نتیجہ نکلا تھا' وہ الیاس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ دونوں نے انہیں خود سر' باغی اور نافرمان کا خطاب دیا تھا اور ان پر پاکستان واپس آنے کے لیے دباؤ ڈالا تھا۔

اس دن کے بعد الیاس نے وقفے وقفے سے ان کو منانے کی کوشش کی تھی اور فائدہ صرف اتنا ہوا تھا کہ ان کو ملنے والے خطابات روز بروز بڑھنے لگے تھے۔

حیفہ اس ساری صورت حال سے الگ پریشان تھی۔

پھر ایک دن الیاس نے پاکستان جا کر والدین کو منانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ فون پر وہ شاید اس کی مجبوری اور محبت کو صحیح طرح سمجھ نہیں پا رہے۔ شاید روبرو بات کرنے اور بھائیوں کے ساتھ کے بعد حالات مناسب رخ اختیار کر لیں' لیکن یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔

پاکستان آنے کے بعد انہیں غضب ناک آواز کے ساتھ ساتھ نفرت انگیز تاثرات بھی دیکھنے کو ملے تھے۔ دونوں الیاس کے بچپن سے اب تک کے سارے احسانوں کی فہرست مرتب کیے بیٹھے تھے۔ اور انہیں جذباتی بلیک میل کرنے کا آخری حربہ آزما رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس بات پر بھی بضد تھے کہ الیاس شہناز سے ابھی کہ ابھی شادی کر کے ہی واپس امریکہ جائیں۔

شہناز میں کوئی برائی نہیں تھی' لیکن یہاں معاملہ دل کا تھا جو پوری طرح حیفہ کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔ الیاس نے اسی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ کیا جو ایسے موقعوں پر عموماً" لڑکے کرتے ہیں۔

رات کے ایک پہر انہوں نے اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

امریکہ واپس آ کر انہوں نے حیفہ سے شادی کر لی۔ پاکستان سے ان کا ہر کسی سے ناتا ٹوٹ گیا تھا۔ سوائے سب سے چھوٹے بھائی جلال کے۔

دو سال بعد دونوں کے گھر بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کا نام انہوں نے بیانکا (خالص سفید) رکھا تھا۔

تین سال بعد وہ دونوں اپنا گھر خریدنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور بہت خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔

اپنے آفس میں کام کے دوران الیاس کی نظروں سے زراعت کے شعبے میں حکومت کی غیر معمولی اور بڑھتی ہوئی دلچسپیوں کے منصوبے کے خاکے گزرے تو اسے اپنے چھوٹے بھائی جلال کریم کا خیال آیا تھا۔ جلال کی تعلیمی قابلیت اگرچہ الیاس جتنی نہیں تھی۔ لیکن زراعت میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی۔ خصوصاً" دھان اور سورج مکھی کی فصلوں میں وہ کسی حکیم کا سا درجہ رکھتا تھا۔

الیاس نے جلال سے بات کی کہ وہ یہاں آ کر اپنی قسمت آزمائے اور جلال دو ماہ بعد ہی امریکہ چلا آیا۔ یہاں جلد ہی اس کا کام بن گیا اور نیویارک سے تقریباً" چار گھنٹے کی مسافت پر (کنیٹکی کٹ) میں اسے ایک جاب مل گئی۔

ایک سال بعد جلال نے اپنے بڑے بھائی غفار اور اپنی بیوی فیروزہ کو بھی پاکستان سے امریکہ بلا لیا تھا۔ غفار کی شادی الیاس کے گھر چھوڑ کر جانے کے بعد شہناز سے کر دی گئی تھی۔ الیاس ان دنوں بہت خوش تھے' ناراضگی اور لاتعلقی کی برف رفتہ رفتہ پگھلنے لگی تھی۔

دو سال بعد شہناز اپنے بڑے بیٹے احمد کے ساتھ اکیلی امریکہ نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ الیاس کے والدین بھی تھے۔ الیاس نے ان سے معافی مانگنے میں پھر دیر نہیں کی۔۔۔ دونوں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اور تعلقات کافی استوار ہو چکے تھے۔

پھر باپ کی وفات کے چند ماہ بعد ہی ماں کی وفات

نے گویا ہر طرح کی رنجش ہی ختم کردی۔

تب سے الیاس کا یہ معمول تھا کہ وہ ہفتے دو ہفتے بعد ایک دو دن اپنے بھائیوں اور بھابھیوں کے ساتھ گزارہ کرتے تھے' کنیٹکی کٹ کے مضافات میں سورج مکھی کے کھیتوں کے درمیان ایگریکلچر اتھارٹی کی طرف سے ملا ہوا ایک بہت بڑا گھر تھا جہاں اس کے بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔۔۔ غفار اور شہناز کا صرف ایک بیٹا تھا۔ احمد' جبکہ جلال اور فیروزہ شادی کے بائیس سال بعد تک بے اولاد تھے۔

حیفہ بھی اکثر الیاس کے ساتھ وہاں جاتی تھی' لیکن نجانے کیا بات تھی حیفہ ان سے زیادہ بے تکلفی پیدا نہیں کرسکی تھی اور اس معاملے میں وہ ان لوگوں کو ہی موردالزام ٹھہراتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے قیمتی مشورے سے جلال اور فیروزہ کو بارہا نواز چکی تھی کہ وہ کوئی بے بی اڈاپٹ کرلیں' لیکن اس معاملے میں ان کی پرانی قدریں آڑے آجاتی تھیں۔

الیاس کا آج کا بھائیوں کی طرف جانا بھی اس کے پرانے معمول کا ہی حصہ تھا۔ سیل فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور حیفہ مام اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھیں۔ انہیں اطلاعی گھنٹی کے بجنے کا انتظار تھا اور سیل فون کی بجتی گھنٹی نے ان کے ٹوٹ چکے اعصاب پر گویا گورکن کا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ان کی چھٹی حس بھی گھنٹی کے ساتھ ساتھ بڑے خطرناک انداز میں جھنجھنا رہی تھی۔

بیانکا نے ہی فون ریسیو کیا تھا۔

''ہیلو۔۔۔ حیفہ بھابھی۔'' چچا جلال کی آواز آئی تھی

''نہیں چچا۔۔۔ میں بیانکا بات کررہی ہوں۔''

''بیانکا! حیفہ کہاں ہے؟۔۔۔ رہنے دو۔۔۔ اسے نہ بلاؤ۔۔۔ میں' میں بیانکا میری بات غور سے سنو بیٹی! ذرا تحمل اور حوصلے کے ساتھ۔''

''کیا بات ہے چچا۔۔۔؟''

بیانکا کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس نے اپنی آواز کو دھیما کرلیا تاکہ حیفہ مام نہ سن پائیں اور رخ بدل لیا کہ وہ اسے دیکھ بھی نہ سکیں۔

''بیانکا۔۔۔ بیانکا بیٹی۔۔۔ دراصل۔۔۔ خدا کے لیے پہلے تم کہیں بیٹھ جاؤ۔۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ الیاس بھائی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔۔۔ تم پریشان مت ہونا۔۔۔ غفار بھائی اور احمد انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں۔۔۔ تم ایسا کرو۔۔۔ تم اور حیفہ بھابھی یہاں ہی آجاؤ۔۔۔ الیاس بھائی کی صحت کے بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔۔۔ ہم تو بس دعا ہی کرسکتے ہیں۔۔۔ تم سن رہی ہونا بیانکا۔۔۔ تم دونوں جلدی یہاں پہنچو۔۔۔ بیانکا تم مجھے سن رہی ہونا بیانکا۔۔۔ بیانکا۔۔۔ بیانکا۔''

اوندھے ہوئے موبائل سے نکلتی چچا جلال کی آواز چوبی فرش سے ٹکرا کر بڑی دہشت ناک صورت حال اختیار کررہی تھی۔



البانیہ کا شہر ارجیرو۔۔۔

ارجیرو کی جنگلی درختوں والی پہاڑی سرد ہواؤں نے اسے کسی بچے کی طرح گود میں اٹھا کر بھرپور بوسہ دیا تھا۔ ساڑھے تین سال کی لمبی غیر حاضری کے عرصہ نے اس بوسے کو بے پناہ منتظر اور طویل کردیا تھا۔

وہ ینسٹل یونیورسٹی (یوجرس) میں قیام کے ساڑھے تین سال بعد ارجیرو واپس لوٹا تھا۔ اس کے مستقل طور پر امریکہ سے البانیہ آجانے میں ابھی مزید چھ ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی پندرہ روزہ ہنگامی چھٹیوں نے اسے اچانک البانیہ کا دورہ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ نجانے اسے اماں زنتوبیہ کی یاد یہاں کھینچ لائی تھی یا بابا زلاری کی 'میرین' طامیریا حسنی کی۔۔۔ اس بات کا فیصلہ کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ ان سارے عوامل نے مل کر اس کے ذہن پر دباؤ ڈالا تھا اور وہ سب کو حیران اور خود کو خوش کرنے البانیہ پہنچ گیا تھا۔

ٹیکسی سے اتر کر اس نے ایک طویل اور خوشگوار سانس اندر کھینچا تھا۔ جنگلی درختوں سے ٹکرا کر آتی ہوا میں خون کو معطر۔۔۔ کردینے کی طاقت تھی۔ اس

گہرے سانس نے اس کی سفر کی ساری تھکن کو پلک جھپکتے میں دور کر دیا۔ وہ ہر درخت اور پتے کی خوشبو کو اپنی اندر کھینچ لینا چاہتا تھا۔ درختوں سے محبت کرنا اسے بابا زلاری نے سکھایا تھا اور وہ اس شاگردی میں اتنا طاق رہا تھا کہ درختوں سمیت انسانی تعلق کے ہر معاملے میں بھی محبوب بننے کو ترجیح دیا کرتا تھا۔

ٹیکسی اس نے اپنے گھر سے بہت پیچھے اور نیچے ہی رکوالی تھی۔ راستے میں اسے بہت سے لوگوں سے ملنا تھا۔ اپنے دیرینہ دوست طامیر سے ’منگیتر سیرین سے اور ... اور ”کدام“ کے درخت سے بھی ... مسکراہٹ اس کے لبوں پر گل صد برگ کی طرح کھلی ہوئی تھی۔

اس نے تینوں منزلوں کو ملانے والی پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا۔ یہاں سے ارجیرمال (فوڈ سٹریٹ) تک کا راستہ تقریباً“ دو کلومیٹر تھا اور دو کلومیٹر کی یہ چڑھائی آج کسی صورت اسے تھکا نہیں سکتی تھی۔ اس نے زمین کی کشش کی ہم نوائی اور مہمانی کو قبول کیا اور چڑھنا شروع کر دیا۔

ساڑھے تین سالوں نے ارجیر پر زیادہ نمایاں اثرات مرتب نہ کیے تھے۔ کچھ تعمیرات نئی ہوئی تھیں۔ کچھ ہوٹل گھر اور درخت مزید اونچے ہو گئے تھے۔ چند ایک نئی پگڈنڈیوں نے جنم لیا تھا۔ اور راہ میں پڑنے والے جھرنے سکڑاؤ کا شکار ہوئے تھے۔

اوپر چڑھتے چڑھتے وہ سوچنے لگا کہ ان گم شدہ سالوں نے اس کے چاہنے والوں پر کیا کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے۔

طامیر کی داڑھی کے بال یقیناً مکمل طور پر آ چکے ہوں گے۔ عالم شباب سے ہی اس کے چہرے پر بالوں کی تعداد خاصی کم تھی۔ اسی وجہ سے دونوں کے مشترکہ دوست اسے لڑکی لڑکی کہہ کر چھیڑتے تھے۔ تنگ آ کر طامیر نے چپکے چپکے بہت سے ٹوٹکوں کو آزمانا شروع کر دیا تھا۔ خصوصاً“ چہرے پر انڈے کی زردی لگانے والے عمل کو تو وہ تقریباً“ روز ہی کیا کرتا تھا۔

اور سیرین... اس کی چھیل ہرن کی سی کرنجی آنکھوں میں بھسم کر دینے کی طاقت کیا کیا نہ تھا ٹھیں مارتی ہو گی اور اس کے گال جو پہلے ہی دہکتے ہوئے لگتے تھے۔ اب تو انہوں نے آگ ہی پکڑلی ہو گی۔

اپنے تخیل میں کچھ سوچ کر وہ مسکرایا اور اس طرح مسکرایا کہ پرواز کرنے والے پرندے رک کر اسے دیکھنے لگے اور ولائی (طرز مخاطب) حسنی... سنجیدہ... بردبار اور کم گو... شاید ان کے چہرے کے چوب دار تاثرات میں کچھ لچک آ گئی ہو۔

اس کے پیروں کے نیچے مرجھائے سوکھے پتوں کے ڈھیر آ کر چرمرانے لگے تھے۔

اماں زیتو یہ... اور بابا زلاری... جو ہر وقت ”سان“ اور ”سلی“ کے لقب کو لے کر نوک جھونک کیا کرتے تھے یا تو یہ القاب بھول گئے ہوں گے یا ان کو لے کر دونوں میں باقاعدہ زبردست قسم کی لڑائی ہوتی ہو گی۔

اس نے پشت پر لٹکتے سفری بیگ کو دائیں کندھے سے اتار کر بائیں کندھے پر ڈالا... بوجھ زیادہ تھا اور اس کی تمام تر خوشی کے آگے ہیچ بھی... اس نے رک کر اوپر تک جاتی پگڈنڈی پر نظر ڈالی... دھوپ میں بدلتی چھاؤں سارے راستے واضح کرنے لگی تھی۔

شہرام کے والدین کا ارجیرمال پر ایک وسیع و عریض ریسٹورنٹ تھا۔ جس کا کافی حصہ اس باغ پر مشتمل تھا جس سے قلہ (پہاڑ کی چوٹی) اور جھرنے کی خوب صورتی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

لیکن یہ ریسٹورنٹ صرف اپنی خوب صورتی کی وجہ سے مشہور نہیں تھا‘ بلکہ اس کے کھانوں کی شہرت اس کی خوب صورتی سے کہیں زیادہ تباہ کن تھی۔ ریسٹورنٹ میں باربی کیو کی تو تقریباً“ ہر ہی قسم فراہم کی جاتی تھی۔

اماں زیتو یہ اپنے رعب‘ قابلیت اور تجربے کی بنا پر اس ریسٹورنٹ کی ہیڈ تھیں۔ باقی معاملات میں کچھ لچک سہی‘ لیکن گرل (بھٹی) پر کھڑے ہونے کی اجازت کسی ملازم کو کیا خود بابا زلاری تک کو نہیں تھی۔ وہ پچھلے بیس سالوں سے باربی کیو کر رہی تھیں

اور صرف وہ ہی کر رہی تھیں۔ ان کے پکائے کبابوں' بنا تیل کے بنی مچھلی اور تندور میں پکی چانپوں کی شہرت ارجیری فضاؤں کو پار کرکے البانیہ کے دوسرے شہروں تک پھیلی ہوئی تھی۔

تھکاوٹ اور بیماری کو تو کوئی اہمیت ہی نہ دی جاتی اور اگر کوئی خاص مجبوری آبھی جاتی تو گرل کسی ملازم یا بابا زلاری کے حوالے کرنے کے بجائے ریسٹورنٹ کو ہی بند کردیا جاتا۔ اماں زنتوبیہ اپنے اصولوں میں کھجور کے درخت کی طرح سخت اور کھردری تھیں۔ وہ اس معاملے میں بابا زلاری پر بھی اعتماد نہ کرتی تھیں۔

"جس سان (بڑے اوزار تیز کرنے کا پتھر) پر تم ٹوکے چھریاں تیز کرتے ہو' اس کا وار میری محنت پر کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارا کام مسالے پیسنا' گوشت کاٹنا اور میزبانی کرنا ہے۔ کیا میں نے کبھی تمہارے کاموں میں دخل دیا۔ میرے ہوتے ہوئے گرل پر کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔" اماں زنتوبیہ فیصلہ کن لہجے میں کہہ دیتیں۔

بابا زلاری اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی چٹان کو تو کھسکایا جاسکتا ہے' لیکن اماں زنتوبیہ کو ان کے فیصلے سے ہرگز نہیں... لیکن پھر بھی انہیں اماں زنتوبیہ کو چڑانے میں ایک خاص لطف آتا تھا۔

"تم سمجھتی ہو' تم کامل ہو... دنیا میں ہزاروں' لاکھوں جگہ پر گرلنگ ہورہی ہے اور وہ سب تم سے کہیں زیادہ بہتر کررہے ہوں گے۔ تمہیں گھمنڈ ہے کہ کوئی تمہارے جیسی کرہی نہیں سکتا۔"

"ہاں... مجھے یہ ہی گھمنڈ ہے... میں لمحے بھر کے لیے رسک نہیں لے سکتی۔ کوئی اور یا تو کبابوں کو جلا دے گا یا کچا رہنے دے گا۔ میری برسوں کی محنت رائیگاں چلی جائے گی اور برسوں کے خوش باش گاہک ناراض ہونے لگیں گے۔ ہم میں سے میرے علاوہ کوئی اور یہ کام نہیں کرسکتا... خاص کر تم زلاری..."

اماں زنتوبیہ بھی بابا کو چڑاتیں... وہ طنز کرنے کے لیے ہروقت موقع کی تاک میں رہا کرتی تھیں۔

پھر ایک واقعہ ایسا ہوا' جس نے بابا زلاری کو گویا نہال ہی کردیا۔

مال کو پر رونق اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنانے کے لیے حکومت نے کچھ ترقیاتی کاموں کا آغاز کیا تھا۔ وسیع مال پر اپنے اپنے نام کے جھنڈے گاڑنے کے لیے دو مشروب ساز کمپنیوں میں کھینچا تانی چل رہی تھی۔ اماں زنتوبیہ نے ایک کمپنی کی آفر کو رد کرکے دوسری کمپنی سے دوگنی قیمت پر پانچ سال کا کنٹریکٹ کیا تھا۔ نادانی اور کسی حد تک بے وقوفی میں کیا گیا یہ کنٹریکٹ ایک ایسی غلطی ثابت ہوا جس کا اندازہ انہیں وقت گزرنے کے ساتھ ہوا تھا۔ نیون سائن کو روشن رکھنے کے علاوہ پہلی کمپنی ریسٹورنٹ کے پینٹ کے لیے بھی ہر چھ ماہ بعد معقول رقم دینے والی تھی اور ان کا کنٹریکٹ رقبے کے لحاظ سے تھا۔ دوسری کمپنی سے ملی دگنی قیمت پہلی کمپنی کی مجموعی رقم کا چوتھا حصہ بھی نہ تھی۔

شرمندہ شرمندہ اماں زنتوبیہ چاہتی تھیں کہ یہ باتیں کسی بھی طرح بابا زلاری تک نہ پہنچیں پر ایسا ہو کررہا۔

اماں زنتوبیہ کے علاوہ گھر کے باقی افراد اس دن ساری رات ہنس ہنس کرلوٹ پوٹ ہوتے رہے۔

"قصور اس کا بھی نہیں... یہ سلی (اوزار تیز کرنے کی چھوٹی پتھری) ہے نہ... چھوٹے وار کرنے والی... عورت بڑے وار کرنے کا سوچ تو سکتی ہے' لیکن بے چاری کر نہیں سکتی... اس کی حیثیت ہی ادنیٰ ہوتی ہے... دنیا کی ساری عورتیں ہی سلیاں ہیں... بے وقوفی کی انتہا پر پہنچی ہوئی۔ صرف مرد ہی سان ہوتا ہے۔ بڑے وار کرنے والا' ایک ہی وار میں چت کر جانے والا۔"

"اچھا... اب بس کرو۔"

بابا زلاری کے ہاتھ قسمت سے جو موقع آیا تھا' وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھارہے تھے اور اماں زنتوبیہ کی برداشت جواب دیتی جارہی تھی۔

"عورت کسی قابل ہوتی تو دنیا کی جنگوں میں اس کا بھی نام ہوتا... لیکن تمہاری ماں کو کیا ہوا... یہ تو خود کو

سارے جہان کے مردوں سے زیادہ عقل منداور ذہین و فطین سمجھتی تھی۔"
بابا زلاری کا لیکچر ختم نہیں ہو رہا تھا۔ غصے سے اماں زیتو بیہ کا چہرہ لال ٹماٹر ہو گیا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر شہرام اور ولائی حسنی کی ہنسی نہ تھمنے میں آتی تھی۔
اس دن کے بعد دونوں کے لقب "سان اور سلی" ہو کر رہ گئے تھے۔
اور ان القاب پر جس جس طرح کی لڑائی ہوئی تھی وہ کچھ کچھ صلیبی جنگوں سے ملتی جلتی تھی۔
چلتے چلتے شہرام کدام کے گھنے سایہ دار درخت کے قریب آگیا تھا۔
یہ درخت اسے اپنے بچپن سے ہی دیودار اور صنوبر کے درختوں کے جھرمٹ میں گھرا بڑا عجیب فسوں خیز لگتا تھا۔ جیسے اس کی قلم کسی چیتان سے آئی ہو یا اس کی آبیاری کسی برگزیدہ ہستی نے کی ہو۔
شہرام اور سیرین کے بیشتر موسم اسی درخت کے حدود اربعہ میں گزرے تھے۔
بیضوی سنگی ٹیلے پر چڑھ کر وہ شاخ تلاش کرنے میں شہرام کو زیادہ وقت نہیں لگا، جس پر اس نے چار گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد ایک گلاب کا پھول ابھارا تھا۔
پھول ابھی بھی ویسا ہی تھا۔ کوئی پتی چھیلی ہوئی یا ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔ البتہ رنگ پر کائی کی دبیز تہہ چڑھ گئی تھی جو ٹھہرے ہوئے پانیوں کا مقدر ہوتی ہے۔
پھول کو جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔
بابا زلاری اپنے روزمرہ کے کاموں کے علاوہ لکڑی پر مصوری کرنے کا شوق بھی رکھتے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر یہ شوق کسی حد تک شہرام میں بھی منتقل ہو گیا تھا۔
ایک دوپہر وہ گھر سے بابا زلاری کے سارے اوزار اٹھا لایا تھا' اور کدام کی ایک موٹی شاخ پر گلاب کا پھول کاڑھنے کے لیے اس نے اپنی ساری توانائی اور تخلیقی قوت صرف کر دی تھی۔ وہ محض لکیریں نہیں تھیں۔ بلکہ شاخ سے پھوٹتا کوئی اصلی پھول معلوم ہوتا تھا۔
قریب ہی سیرین بھی کچھ بنانے میں مشغول رہی تھی۔
جب شہرام کا پھول ابھر آیا تو اس نے سیرن کی بنائی شبیہ پر توجہ دی تھی۔ وہ لالے کا پھول تھا۔ ناگواری کا ایک احساس شہرام کو چھو کر گزر گیا۔
"مانا کہ میں تمہارے جتنی ماہر نہیں ہوں۔ مگر پھول اتنا بھی برا نہیں بنا کہ تم میری حوصلہ افزائی نہ کر سکو۔"
وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ایسے میں اس کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو جاتی تھی اور شہرام اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ اور دیکھنا بھول جاتا تھا۔
"تم نے لالے کا پھول کیوں بنایا؟"
"کیونکہ یہ مجھے پسند ہے۔"
"کیا تمہیں نہیں پتا کہ لالہ گلاب کا رقیب ہے؟"
شہرام نے سنجیدہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا تھا اور سیرین قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔ شہرام سب کچھ بھول کر وقتی طور پر خود کو اس دنیا کا بادشاہ سمجھنے لگا تھا۔
"یہ باتیں شاعری اور افسانوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ سائنس اور حقیقت پر بھروسا کرنا سیکھو۔"
"پھر بھی تمہیں کچھ اور بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔"
"اگلی بار تمہاری نصیحت پر عمل کروں گی.... اب چلو کافی دیر ہو گئی ہے۔" وہ شہرام کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی۔ شہرام تھکے قدموں سے اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ نظر انداز کر دینے کے باوجود گلاب کے پھول کے ساتھ لالے کے پھول کا منظر اس کی شعور کی آنکھ سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ اس نے اس منظر کو براشگون جانا تھا۔
دو ماہ بعد جب دونوں کی منگنی اس دھوم دھام سے ہوئی کہ پورا ارجیر حیران رہ گیا تو اس کے تمام منفی خیالات اور وسوسے خود بخود ہی ختم ہو گئے تھے۔
پگڈنڈی نے ایک جگہ کھلے احاطے کی صورت اختیار کر لی تو وہ رک گیا۔ طامیر کے گھر کا کھلا دروازہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس نے کھلے دروازے کے ایک پٹ میں منہ ڈال کر اندر دیکھا۔
مخملی رو ئیں دار سفید پروں والے رومالی کبوتروں کا غول تھا جو دہلیز کے آگے سے صحن میں چاروں طرف

بکھرے دانے کو چگتے ہوئے غٹرغوں غٹرغوں کر رہا تھا۔ معاً چند کبوتروں نے شہرام کے چہرے کو دیکھ لیا اور ایک اجنبی کو دیکھ کر خوف سے ان کی غٹرغوں مزید بلند ہو گئی۔

طامیر وسیع صحن کے درمیان اسٹول پر بیٹھا کبوتروں کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ شہرام نے ایک قدم اندر رکھا تو دہلیز کے قریب بیٹھے کبوتر اڑ کر دور چلے گئے۔ طامیر نے سر اٹھایا تھا۔

"شہرام...!" شہرام کو دیکھ کر طامیر گویا سکتے میں جا کر بری طرح چونکا تھا۔ "شہرام میرے دوست... اس طرح اچانک..."

وہ اس بے خودی سے اٹھا کہ گود میں دھری باجرے کی تھالی زمین پر لڑھک گئی اور اس کے تیز قدموں کے باعث کبوتروں کا سارا غول اڑ کر آسمان کی طرف نکل گیا۔

طامیر نے دیوانہ ہو کر شہرام کو چوم ڈالا اور بازوؤں میں کس کے کچھ اس طرح پکڑا کہ شہرام زمین سے دو انچ اوپر اٹھ گیا۔

"آ... ہائے..." شہرام کے منہ سے آہ نکل گئی تو طامیر ہنسنے لگا۔ اس نے اسے واپس زمین پر چھوڑا۔

"مجھے پہلے کیوں نہ اطلاع کی... اتنی دور سے آمد کا پروگرام اچانک نہیں بن سکتا... میں تجھے لینے ایئر پورٹ آتا۔"

"میں بتا کر آتا تو یہ منظر بھلا کب دیکھنے کو ملتا۔" شہرام نے گرے ہوئے باجرے کی طرف اشارہ کیا تو طامیر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

"سامان تو اتار کندھے سے... اندر بیٹھ... کتنے دنوں کے لیے آیا ہے... خدایا کتنی باتیں ہیں تجھ سے کرنے والی... نہ جانے ان دنوں میں ہو بھی سکیں گی کہ نہیں۔" وہ اس کے کندھے سے سامان اتارنے لگا۔

"بیٹھوں گا، مگر ابھی نہیں... ابھی مجھے اوپر (پہاڑ کے اوپر) جانا ہے... امی ابو سے ملنا ہے... یہ بیگ بھی پکڑ لے... میرے تو ہاتھ درد کرنے لگے ہیں... آنٹی کہاں ہیں۔"

"امی بازار گئی ہیں... تو تھک گیا ہو گا... تھوڑی دیر بیٹھ جا... کبوتروں کے واپس آنے کا انتظار کر لیتے ہیں۔"

"نہیں میں بالکل نہیں تھکا... بیٹھ گیا تو یقیناً آرام کرنے کا دل کرے۔"

"اچھا۔ پھر مجھے تالا ڈھونڈنے دے۔ اماں پتا نہیں ایسی چیزوں کو کہاں رکھتی ہیں۔"

"نہیں مل رہا تو رہنے دے... تالے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں یار... ارچیر میں پچھلے کئی ماہ سے بہت سی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔ کیا خالا زنتوسیہ کو بھی نہیں پتا تیرے آنے کا۔"

"انہیں انہیں بھی نہیں پتا... کیسی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

واپس باہر آتے ہوئے شہرام نے پوچھا تھا۔ طامیر لمحے بھر کو چپ ہو گیا تھا۔

"بس ویسی ہی جیسی دنیا کے باقی حصوں میں ہوتی ہیں۔ کچھ دستوری... کچھ قلبی... ان وارداتوں پر زیادہ حیران نہیں ہونا چاہیے... تجھے ایک فون تو کرنا چاہیے تھا۔" طامیر نے بات کا موضوع بدلا۔

پشت پر طامیر کا گھر ایک دھبے کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ دونوں کافی آگے بڑھ گئے، تو پگڈنڈی کے ایک ایسے موڑ پر جہاں پگڈنڈی دو شاخہ ہو جاتی تھی۔ شہرام نے طامیر کو کراس کیا تھا۔

"یہاں کہاں... ہمیں تو اوپر جانا ہے۔" طامیر نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ہاں... پر پہلے مجھے سیرین سے ملنا ہے۔"

"بعد میں مل لینا۔"

"حرج ہی کیا ہے... صرف چند منٹ ہی تو زیادہ کا سفر ہے۔"

شہرام چلنے لگا اور ایک بات اس نے واضح طور پر نوٹ کی کہ سیرین کا نام لینے پر طامیر کے چہرے پر بڑی کٹھور سی سختی در آئی تھی۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ طامیر نے اس کٹھور سختی کو چھپانے کی کوشش

بھی نہیں کی تھی۔ شہرام نے اسے وقتی رویہ جان کر نظر انداز کردیا تھا۔ ورنہ طامیر یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ دنیا میں اگر شہرام کے لیے کوئی جنت تھی تو اس جنت کا نام بلاشبہ سیرین ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے پر رفتہ رفتہ سلگنے لگے تھے اور دھواں تھا کہ سارے منظروں کو اودی پرچھائیوں سے ڈھکتا جارہا تھا۔

وقت کی سانسوں میں بند قبر کی سی وحشت تھی۔ چیزیں اپنے وجود کے ساتھ موجود تو نظر آتی تھیں لیکن نزع کے کرب میں مبتلا لحہ بہ لحہ مرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

وہ چار گھنٹوں کا سفر مختصر نہیں ہوتا تھا۔ اس چار گھنٹے کے سفر میں چار صدیاں سرائیت کرگئی تھیں اور بیانکا کی عمر اتنی نہیں تھی۔ اس لیے وہ مر مر کر دوبارہ زندہ ہورہی تھی۔ اس بار بار مرن جیون کے کھیل نے اسے ہلکان کرکے ادھ موا کردیا تھا۔

دعا مانگنے کے لیے وقت بہت زیادہ تھا، لیکن قبولیت کے لیے شاید بہت کم۔ کچھ فضا میں موت کی باس اس طور پھیلی تھی کہ دعا صرف لبوں سے ادا ہوتی تھی۔ دل اس دعا کے ساتھ نہیں دھڑکتا تھا۔

پھر سفر کے اختتام پر جو منظر ان کے سامنے تھا وہ تخیلاتی طور پر ناقابل یقین سہی۔ لیکن تصوراتی حس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

بیانکا کو یاد نہیں تھا کہ وہ اپنے بچپن سے لے کر اب تک کبھی روئی بھی تھی۔ اسے تو صحیح طرح سے رونا بھی نہیں آتا تھا، لیکن رونے کا عمل اچانک پھوٹ پڑنے والے آتش فشاں کی طرح ہوتا ہے۔ اسے سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے لیے کوئی استعارہ درکار نہیں ہوتا۔ ماں کی کوکھ میں ہی یہ بیراگ انسان کے وجود میں شامل کردیا جاتا ہے۔

وہ غم زدہ ہوکر اتنا روئی تھی اور شوریدہ سری میں اتنا چلائی تھی کہ حیفہ مام اپنا غم بھول کر اسے سنبھالنے لگی تھیں۔ اسے کسی طور یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اب کبھی اپنے ڈیڈ الیاس کو نہیں دیکھ سکے گی۔ لمحوں میں پہلی بار وہ بچی سے بڑی ہوگئی تھی اور جب اسے اس بات کا یقین ہوگیا تو وہ تڑپ تڑپ کر یہ دعا کرنے لگی کہ یہ آخری دیدار اس کی پوری زندگی پر اپنی وسعتیں پھیلا دے۔ وہ ساری زندگی اس تخت کے سرہانے بیٹھی رہنے کو تیار تھی جس پر ڈیڈ الیاس کی میت پڑی ہوئی تھی۔ وہ وہیں مجسم ہوجاتی۔ وہیں میخ جاتی اگر میت اٹھانے کے لیے لوگ نہ اندر آجاتے۔

حیفہ مام اپنے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی صاف کررہی تھیں۔ انہیں خود کے ساتھ اسے بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ وہ دہرے غم سے گزر رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ بیانکا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے علاوہ ایک سنگریزہ بھی قید ہے جو اس کی آنکھوں میں کب سے بری طرح چبھ رہا ہے۔

ڈیڈ الیاس کی گردن کے نیچے ایک گہرے سرخ ابھار کی لمبی سی دھار تھی۔ جو بالکل تازہ لگتی تھی۔ یہ دھار کسی چوٹ کی نہیں تھی.... بلکہ کسی پوشیدہ خفیہ بیماری کی طرف اشارہ کرتی تھی۔

شاید انہیں علم ہوگیا تھا کہ وہ اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ تب ہی چند ماہ پہلے انہوں نے اپنے سارے اثاثے بیانکا کے نام منتقل کردیے تھے۔ وہ اس پریشانی کے عذاب میں خود کیوں جلتے رہے۔ انہوں نے ہمیں کیوں نہ بتایا۔

روتے ہوئے بیانکا کو اپنے ڈیڈ الیاس سے شکوہ ہوا تھا۔ حیفہ مام کے آنسوؤں کا بند قبرستان سے واپسی پر ٹوٹا تھا۔ پچیس سال بعد وہ ایک بار پھر کسی مہاجر کی طرح لق و دق صحرا میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی بانگ درا کو انہوں نے نہیں سنا تھا اور نقش پا ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔

اب کوئی الیاس ان کی رہنمائی کرنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ چچا جلال نے انہیں اپنے گھر مزید کچھ وقت گزارنے کے لیے کہا تھا، لیکن دونوں تین چار دن بعد نیویارک واپس آگئی تھیں۔

زندگی کے کچھ زخم ایور گرین پودے کی طرح ہوتے ہیں۔ ہمارے دکھ 'رنج' سوچوں اور مردہ جذبوں کے پانی کی آبشار ہمیشہ انہیں بھگوئے رکھتی ہے اور زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔

یہ زخم جو رستے رہتے ہیں اور کبھی نہیں بھرتے۔ ان زخموں پر وقت کا دیوہیکل گھڑیال بھی شرمسار ہوتا ہے۔

"اب ہم جلد ہی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائیں گے بیانکا۔۔۔ اس گھر کی وسعت میں اب میرا دل گھبرائے گا۔" گھر آتے ساتھ ہی حیفہ مام نے بیانکا سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے مام۔۔۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

آنے والے وقت میں حیفہ مام نے اپنے بازوؤں کے حصار کو چھوٹا ہوتا پایا۔ ہر چیز ان کے ہاتھوں سے نکلنے لگی تھی۔ ان میں اب اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ ہر معاملے کی الیاس کی طرح دیکھ بھال کریں۔ کچھ پراپرٹی تھی جس کا رینٹ ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ الیاس کے بعد زندگی ویسی ہی پر آسائش ضرور تھی 'لیکن تنہائی کا شکار بھی ہو چکی تھی۔

وہ الیاس کریم کی وفات کے تقریباً" ایک ماہ بعد کا دن تھا۔ جب ان دونوں نے اپنا سارا سامان بند کارٹنوں میں پیک کر کے اپارٹمنٹ منتقل کیا تھا اور اسی دن چچا جلال کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اپنے گھر آنے کے لیے کہا تھا۔

"حیفہ! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔۔۔ بیانکا کو بھی ساتھ لے آنا۔"

"ٹھیک ہے بھائی صاحب! ہم کل آجائیں گے۔"

فون رکھنے کے بعد حیفہ موم نے بیانکا کو کنٹکی کٹ جانے کے بارے میں بتایا تھا۔

دونوں نہیں جانتی تھیں کہ کل وہاں جا کر وہ اپنی زندگی کی کتنی بھیانک غلطی کرنے والی ہیں۔



سیرین کے گھر کا دروازہ مقفل تھا۔ شہرام بڑی دیر اس مقفل دروازے کو گھورتا رہا' جبکہ طامیر کو ایک گونا تسلی ہوئی تھی۔

"یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟" قریب کھیلتے بچوں میں سے اس نے ایک سے پوچھا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے نیچے کی طرف۔۔۔ شاید بڑے بازار۔۔۔" لڑکے نے اپنی عمر کے مطابق جواب دیا تھا۔

"چلو اب۔۔۔ کیا رات تک یہاں ہی کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔" طامیر نے اسے ٹھوکا دیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ چلتے ہیں۔" وہ افسردگی کے عالم میں آگے بڑھنے لگا۔

اوپر تک پہنچنے کے باقی سارے سفر کے دوران شہرام' طامیر کو پرنسٹن یونی ورسٹی کی باتیں بتاتا رہا تھا۔ باتیں اور قصے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح بڑے پرپیچ اندر ہی اندر بل کھاتے ہوئے اور ایک دوجے کے ساتھ جڑ کر بندھے تھے۔ باتیں بہت تھیں اور زبان صرف ایک۔۔۔ شہرام کی آواز میں چھپی ہوئی عجلت در آئی تھی۔ وہ لمحوں میں سالوں کی کہانیاں سنانا چاہتا تھا۔ خود طامیر کے پاس شہرام کو بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس تہی دامنی کے احساس نے اس کی زبان کو گنگ ہی کیے رکھا۔

وہ دونوں گھر جانے کے بجائے ریسٹورنٹ کی طرف چل پڑے تھے۔ شام ہونے والی تھی اور اماں زیتوبیہ اور بابا زلاری عموماً" اس وقت تک ریسٹورنٹ آجاتے تھے۔ دونوں کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

بھاری بھر کم جسم والی اماں زیتوبیہ سفید قصابہ (عورتوں کا سر پر باندھنے کا رومال) اور سفید ایپرن باندھے شہرام کو دور سے ہی نظر آگئی تھیں۔ ایپرن کے معاملوں میں اماں زیتوبیہ بڑی نفیس اور ایک طرح سے بدقسمت واقع ہوئی تھیں۔ بازار میں ملنے والا کوئی بھی بڑے سے بڑے سائز کا ایپرن بھی ان کے سارے جسم کو ڈھانپنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ مجبوراً" اماں زیتوبیہ کو اپنے لیے خود ہی ایپرن سلوانے پڑتے تھے اور اس کام میں باوجود بے انتہا محنت کے بھی وہ دلکشی نظر نہ آتی تھی' جو فیکٹری سے نکلنے والے ایپرنز کا خاصا

ہوتی ہے۔

"ماما جا..." اندر داخل ہو کر شہرام نے اماں زیتوبیہ کو دور سے ہی پکارا۔ تو انگیٹھی میں کوئلوں کو آہنی سلاخ سے ترتیب دیتے ہوئے انہوں نے آواز کی سمت میں دیکھا تھا اور جیسے لمحے میں ان کے دل کی دھڑکن بے انتہا تیز ہو گئی تھی۔

شہرام خود آگے بڑھ کر ان کے گلے سے لگ گیا تھا اور اماں زیتوبیہ اسے بے تحاشا چومنے لگی تھیں۔

"اوہ میرے بیٹے... اللہ نے کیسا زبردست تحفہ دیا ہے مجھے آج..."

بانہوں میں بھینچ لینے کے باوجود بھی جیسے انہیں شہرام کے آنے کا یقین نہیں ہو رہا تھا۔

"رات ہی مجھے خواب آیا... سب لوگ کہہ رہے تھے کہ دیکھو عید کا چاند نظر آ گیا... اور میں خواب میں ہی سوچتی رہی کہ ابھی تو عید آنے میں چھ مہینے باقی ہیں... مجھے نہ جانے کیوں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ چاند تیری آمد کا اشارہ تھا۔"

"کوئی اور بھی آیا ہے ساتھ خالہ... چاند نہ کہے... دم دار ستارہ ہی کہہ لیں۔"

طامیر نے دروازے سے ہی ہانک لگائی تھی۔ جواباً" تینوں ہنسنے لگے تھے۔ اماں زیتوبیہ نے آگے بڑھ کر اسے بھی گلے سے لگا لیا تھا۔

"بابا کہاں ہیں؟"

"وہ اسٹور میں ہیں... اوزار تیز کر رہے ہیں۔"

"کس پر...؟" اسٹور کی طرف بڑھتے ہوئے شہرام نے کسی قدر شوخی سے پوچھا تھا۔ جواباً" اماں زیتوبیہ بوکھلا گئی تھیں۔

"کر لو... کر لو... اپنے باپ کی طرح تم بھی تنگ کر لو مجھے... ہاں "سان" پر... اور یہ دیکھ۔" وہ انگیٹھی کی طرف بڑھی تھیں۔ پھر وہاں سے ایک چھوٹی سی چیز اٹھا کر انہوں نے شہرام کو دکھائی تھی۔ شہرام اس چیز کو پہچانتا تھا۔ وہ "سلی" تھی۔

"تیرے بابا زلاری نے دی مجھے... میری سالگرہ پر... مجھے تنگ کرنے کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

"کیسا شور ہے یہ باہر... البانیہ کا وزیر تو نہیں آ گیا؟" ٹوکے کی دھار کو دیکھتے ہوئے بابا زلاری اسٹور روم سے باہر نکلے تھے۔ پھر ان کی نظر چاروں طرف گھومی تھی۔

"بابا...!" شہرام کی آواز میں پیار کا لوچ تھا۔ بابا زلاری کا رویہ بھی تقریباً" تقریباً" اماں زیتوبیہ جیسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کل رات ان کو کوئی خواب نہیں آیا تھا۔ شہرام کو چھٹیوں میں اپنے ملک آنے کے فیصلے پر طمانیت بخش احساس ہوا... جو خوشی اسے یہاں آ کر ہوئی تھی وہ دنیا کے کسی کونے میں جا کر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

لیکن پھر اگلے ہی دن اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔



بڑے ہال نما کمرے میں حیفہ مام اور بیانکا کے علاوہ وہ پانچ بھی تھے۔ تایا غفار' چچا جلال' تائی شہناز' چاچی فیروزہ اور تایا غفار کا بیٹا احمد...

تایا غفار اور چچا جلال قدرے بوڑھے ہو گئے تھے۔ ان کے مقابلے میں الیاس اپنے آخری وقت تک فٹ رہا تھا۔ شہناز اور چاچی فیروزہ بھی میک اپ کے سہارے جینے والی خواتین تھیں۔ جبکہ احمد شاہ اپنی پڑھائی کی وجہ سے ان سب سے میچ نہ کھاتا تھا۔ وہ کسی حد تک بیانکا کو پرکشش لگتا تھا۔

بڑے ہال نما کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ وہ چھ لوگ صوفوں پر بیٹھے تھے اور احمد دروازے کے پاس کارنس پر ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ان چاروں کی نظریں قالین کے ڈیزائن میں الجھی ہوئی تھیں اور ہونٹ بند تھے۔

کھانے کا بہت پر تکلف اہتمام کیا گیا تھا اور بیانکا کو آج ان سب کا رویہ بھی معمول سے زیادہ خوش گوار محسوس ہوا تھا۔

"آپ نے کیا ضروری بات کرنی تھی... بھائی

صاحب!" حیفہ مام یہ بات کوئی پانچویں دفعہ پوچھ رہی تھیں۔ لیکن اب تک انہیں ٹھیک سے اس بات کا جواب نہیں دیا گیا تھا۔

اب شاید اس بات کے لیے ہی خاموش رہ کر باقاعدہ تمہید باندھی جا رہی تھی اور بیانکا کو نہ جانے کیوں اس خاموشی سے وحشت محسوس ہو رہی تھی۔

"الیاس تم سے بہت پیار کرتا تھا حیفہ!" بالآخر چچا جلال نے اپنا جھریوں زدہ چہرہ ہلاتے ہوئے بات کا آغاز کیا تھا۔

"اور یقیناً" تم بھی کرتی ہو۔۔۔ اسی لیے مجھے یقین ہے کہ الیاس کی کوئی بھی بات تمہارے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

"آپ بیان کریں میں سن رہی ہوں۔" حیفہ مام نرم لہجے میں بولی تھیں۔

"یقیناً" اس نے تم سے بات کی ہوگی، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو میں بتا دیتا ہوں۔" چچا جلال پھر خاموش ہو گئے تھے۔ چاروں کے چہروں پر مصنوعی جھجک جھلک رہی تھی۔

"دراصل الیاس بھائی اس بات کا اکثر ذکر کرتے تھے کہ بیانکا اور احمد کی شادی ہو جائے؟" بڑا ہال نما کمرہ بیانکا کی نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ اس خاموشی سے وحشت کی وجہ اسے اب سمجھ میں آئی تھی۔

اس نے حیفہ مام کی طرف دیکھا۔ ان کی صرف آنکھیں ہی پھیلی تھیں۔

"الیاس نے کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔" وہ اسی نرم گوئی سے گویا ہوئی تھیں "اور اگر انہوں نے یہ بات آپ سے کی ہے تو مجھے حیرت ہے۔ انہوں نے بیانکا کے لیے احمد کی خواہش کا اظہار کیسے کر دیا۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا حیفہ! ہم سب اس بات کے گواہ ہیں۔"

"الیاس بڑی اچھی طرح یہ بات جانتے تھے کہ بیانکا آریز کو پسند کرتی ہے اور جلد ہی دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔"

پورا ہال گویا دوبارہ سناٹے میں چلا گیا تھا۔ بیانکا، آریز کو پسند کرتی ہے کہ الفاظ کسی نشتر کی طرح سب کے چہروں پر پڑے تھے۔ شہناز اور فیروزہ نے منہ بسورا تھا۔

"بیانکا ہمارے بھائی کی آخری نشانی ہے۔ تمہیں اس رشتے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے حیفہ!"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بھائی صاحب۔۔۔ لیکن اس معاملے میں، میں سارے اختیارات اپنے پاس نہیں رکھتی۔"

"بیانکا کم عمر ہے۔۔۔ نادان ہے۔۔۔ اپنا اچھا برا نہیں سمجھ سکتی۔۔۔ تم اسے سمجھا سکتی ہو۔"

"بیانکا اتنی بھی کم عمر اور نادان نہیں ہے۔ آریز اس کا کلاس فیلو ہے۔ میں اس رشتے سے مطمئن ہوں۔"

"اپنے ہمیشہ غیروں کی نسبت بہتر ثابت ہوتے ہیں حیفہ!"

"آپ کی اس بات سے میں اتفاق نہیں کرتی بھائی صاحب۔۔۔ جب الیاس مجھے ملے تو وہ میرے لیے بالکل اجنبی اور غیر تھے۔ لیکن پھر وہ ہی میرے لیے مکمل ثابت ہوئے، جبکہ لبنان میں میرے اپنے رشتے دار اتنے برے نکلے کہ میں اپنی ماں کی وفات پر بھی وہاں نہ جا سکی۔"

"تمہاری تو کیا بات ہے حیفہ۔۔۔"

جیسے بھرے بازار میں کوئی کسی کو فحش گالی دے دے یہ فقرہ اس طرح ادا ہوا تھا۔ حیفہ مام کے چہرے پر کالے بادلوں کا سایہ آ کر گزرا تھا۔

چچا جلال اب گردن جھکائے جیسے اپنے کسی اندرونی جذبے کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہناز اور فیروزہ بھی جلال کے رویے کی ہی تقلید کر رہی تھیں۔ پھر تایا غفار صوفے پر آگے کو کھسکے تھے۔

"بیانکا ہمارے بھائی کی اولاد ہے۔ کیا ہمارا اس پر کوئی حق نہیں۔ ہمارے بھی کئی ارمان ہیں۔" اب کے جذباتی وار کیا گیا تھا جس میں یہ خاندان پیڑھی در پیڑھی مہارت حاصل کر چکا تھا۔

"آپ کے ارمانوں کی میں دل سے قدر کرتی ہوں۔

آپ چاہیں تو یہ شادی اس گھر سے بھی ہو سکتی ہے' لیکن احمد۔۔۔"

"احمد میں آخر کمی کیا ہے؟"

"بات کمی بیشی کی نہیں۔۔۔ بات پسند کی ہے' بیانکا۔۔"

"ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو اتنی آزادی دینے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ اپنے لیے خود رشتے تلاش کرتی پھریں۔" تایا غفار کی آواز بھی کسی دبے ہوئے غصے کے باعث قدرے تیز ہو گئی تھی۔

"افسوس یہ آپ کا خاندان نہیں ہے۔"

حیفہ مام نے اپنی نرم مزاجی سے یہ ثابت کر دیا کہ انہیں زندگی میں آج پہلی بار اس طرح کے رویوں کا سامنا کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔

"یہ الیاس کا خاندان ہے۔" وہ دو ٹوک گویا ہوئیں۔

"تمہارا خاندان ہے۔" سر اٹھا کر چچا جلال پھر بولے تھے۔ ان کے لہجے سے نخوت کے بیج پھوٹتے تھے اور طنز ستار پر تنی تار کی طرح خوب کس کر نکلا تھا۔ حیفہ مام ان کی شکل دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ میرا خاندان۔۔۔"

انہیں ان سب کے خوش نما چہروں کے پیچھے اپنے لیے نفرت دیکھ کر دکھ ہوا تھا اور یہ دکھ ان کی آواز سے جھلکنے لگا تھا۔

"اس ضمن میں تو پھر ساری بات چیت ہی لاحاصل ہے' اٹھو بیانکا۔" حیفہ مام اٹھی تھیں۔ بیانکا نے بھی اٹھنا چاہا تھا۔

"بیٹھو حیفہ! خدا کے لیے دو منٹ بیٹھو۔" تایا غفار نے منت کی تھی۔

"تم چپ ہو جاؤ خبیث۔۔۔ میں بات کر تو رہا ہوں۔" وہ اپنے سے چھوٹے جلال پر گرجے تھے۔

"حیفہ! تم اس سارے معاملے کو اس رخ سے نہیں دیکھ رہیں' جس رخ سے ہم دیکھ رہے ہیں۔۔۔ بات سنو۔۔۔ اگر تم بیانکا کی شادی غیروں میں کرو گی تو بیانکا کے ساتھ الیاس کی محنت سے کمائی ہوئی ساری دولت بھی غیروں کو چلی جائے گی۔۔۔ اور۔۔۔"

بیانکا اور حیفہ مام۔۔۔ دونوں سناٹے میں آ گئی تھیں۔ ان لوگوں کی سوچ اس حد تک گر سکتی ہے۔ دونوں کو اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

"دولت میری بیٹی کی خوشیاں نگل لے۔۔۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ مفلس ہو جائے۔"

"ہمارا یہ مطلب نہیں۔"

آپ کا مطلب جاننے کی مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں' کیونکہ آپ کا مقصد مجھ پر واضح ہو گیا ہے۔ یہ دولت صرف الیاس کی محنت سے اکٹھی نہیں ہوئی۔ اس میں میری محنت کی حصہ داری بھی شامل ہے۔۔۔ اور اگر آپ اس بات کو نہیں بھی مانتے تو مجھے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ دولت کل بھی بیانکا کی ہے اور آج بھی اسی کی ہے۔"

"لیکن ہمارے بھائی کے اثاثوں پر ہمارا بھی کچھ حق ہے حیفہ!"

"یہ حق قانونی طور پر آپ کا نہیں ہو سکتا' کیونکہ الیاس کی بیٹی اور بیوہ ابھی زندہ ہیں۔"

"کہیں تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے حیفہ۔۔۔ مخالفت میں کیے گئے فیصلے اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں۔" وہ لڑکا نہ جانے کیسا نکلے۔

"کم از کم آپ الیاس کی اولاد کے بارے میں تو اچھا سوچ سکتے ہیں۔۔۔ اور الیاس نہ صرف اس لڑکے کو جانتے تھے۔۔۔ بلکہ پسند بھی کرتے تھے۔"

"یہ فیصلہ کرنے کے بعد تم ایک بار پھر اکیلی ہو جاؤ گی حیفہ۔"

"یہ امریکا ہے۔۔۔ غفار بھائی۔۔۔ یہاں ہر دوسرا شخص اکیلا ہے۔"

"زندگی کے بہت سے موڑ ہیں جہاں تمہیں ہماری ضرورت پڑے گی۔"

"اگر آپ کو الیاس کی اولاد سے واقعی محبت ہو گی تو آپ میرا ساتھ ضرور دیں گے۔۔۔ ورنہ صبر کرنے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہو گا۔"

"تمہیں بھی اس محبت کا ثبوت دینا چاہیے حیفہ۔۔۔

احمد "الیاس کا بھتیجا۔"

"اب میں آپ کو جواب نہیں دوں گی۔ آپ دائرے کی صورت میں بحث کررہے ہیں۔ گھوم پھر کر بار بار وہی بات' وہی سوال' وہی التجا۔"

"سنو حیفہ!" یہ چاچی فیروزہ کی آواز تھی۔

"تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ اگر تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ بیانکا اپنی محبت میں حد سے گزر چکی ہے تو یقین کرو' ہمیں اور احمد کو تب بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہاں کا ماحول۔"

فیروزہ نے کہا اور لمحے بھر میں حیفہ مام نے خود کو ہواؤں میں معلق پایا۔ بیانکا کو سانس لینے کا طریقہ یاد کرنے میں لگا کہ زمانے بیت گئے۔

"آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" حیفہ مام چلائی تھیں۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ "آپ کی ہمت کیسے ہوئی اتنی گھٹیا بات کرنے کی۔" چاچی فیروزہ چپ کرگئی تھیں۔

"اٹھیے مام۔ اب گھر چلتے ہیں۔ بس بہت ہوگئی۔"

"تم بیٹھو۔" تایا غفار دھاڑے تھے اور کچھ اس طرح دھاڑے تھے کہ چچا جلال کو بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ "تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ جب بڑے بات کررہے ہوں تو چھوٹے نہیں بولا کرتے۔"

بیانکا نے حیرت سے تایا غفار کی طرف دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا دماغ بھی درست کام نہیں کررہا تھا۔ روپے پانی کی طرح سر سے اوپر ہوگئے تھے۔

"اس کے والدین نے اسے خود اعتمادی سکھائی ہے۔ کیا اچھا ہے کیا برا۔ یہ جانتی ہے۔" حفیہ مام نے شال کھول کر کندھوں پر ڈالی تھی۔ بیانکا نے ان کا ہینڈ بیگ پکڑ لیا تھا۔

"والدین نے تو اسے اور بھی بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ جیسی ماں ویسی بیٹی' تم نے الیاس کو پھانسا تھا۔ اب بیانکا نے نہ جانے کس کو پھانس رکھا ہوگا۔"

"آپ شروع سے ہی مجھے ناپسند کرتی ہیں۔ اس بات کا مجھے اندازہ تھا' لیکن آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

حیفہ مام کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔ چاروں اپنی جگہوں پر دم سادھے بیٹھے رہے تھے۔ کسی نے انہیں نہیں روکا تھا۔ اب روکنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ حفیہ مام یہاں دوبارہ کبھی نہ آنے کا عزم کرچکی تھیں۔

دروازے کے قریب پہنچ کر حیفہ مام نے ہینڈل گھمایا تھا۔ دروازہ لاک تھا۔

"احمد۔ دروازہ کھولو۔" حیفہ مام نے قریب کھڑے احمد سے کہا تھا۔ کارنس سے پشت ہٹا کر احمد نے صوفے پر بیٹھے اپنے خاندان کی طرف دیکھا تھا۔ سوالیہ نظروں سے۔ جواب نہ جانے کیا آیا تھا۔ احمد اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔

"دروازہ کھولیے۔" پیچھے پلٹ کر حیفہ مام نے سب سے کہا تھا۔ سب یک دم کھڑے ہوئے تھے۔

اور تب ہی۔ تب ہی۔ تیر کے پنجوں کی کھرچ۔ بیانکا نے اس کمرے کی فضا میں سنی تھی۔ یک لخت ان سب کی صورتیں اس قدر بگڑ گئی تھیں کہ بیانکا کو خود پر خوف کی پھونکیں پڑتی محسوس ہوئی تھیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا اور دھڑکن پورے وجود پر چھا گئی تھی۔ گدروں کے دل — اس نے ان سب کی کالی سیاہ آنکھوں میں آکر بیٹھتے دیکھے تھے۔

حیفہ مام کو پیچھے ہٹا کر وہ خود دروازے کا ہینڈل کسی قدر تیزی سے گھمانے لگی تھی۔ ایسے جیسے کسی کم پانی والے کنویں کی چرخی کھینچ رہی ہو۔ دروازہ اپنی جگہ سے سرکا تک نہیں تھا۔

مایوس ہوکر اس نے مضبوط دروازے کو دیکھا تھا۔

"دروازہ کھولیے۔" حیفہ مام چلائی تھیں۔

"یہ دروازہ اتنے آرام سے نہیں کھلے گا۔"

تایا غفار نے کہا تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی زہرخند مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

ان چاروں میں ایک پانچواں احمد بھی شامل ہوگیا تھا اور ان پانچوں کا گھیرا تنگ ہوتے ہوتے ان کے قریب آنے لگا تھا۔

حیفضہ مام کے کندھے کے پیچھے سے اس نے ان سب کو دیکھا تھا۔ جیسے بھیڑیے شکار کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہیں۔ ان کے گرد بھی گھیرا تنگ ہونے لگا تھا۔ حیفضہ مام بیانکا کے آگے کسی ڈھال کی طرح تن گئی تھیں۔

"کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟"

حیفضہ مام نے کانپتی آواز سے پوچھا تھا۔

وہ پانچوں کچھ نہیں بولے تھے، لیکن ان کے خطرناک ارادے ان کے چہروں سے عیاں تھے۔ تب ہی ہال نما کمرے کی دیواریں جیسے پھٹ گئی تھیں، اور ان کی دراڑوں سے کسم کا رنگ ٹپکنے لگا تھا۔

✲ ✲ ✲

"کاسنی رنگ کے بیل بوٹوں والے سنہری مصری مٹی کے سفید لشک والے چھوٹے فنجان (پیالے) تھے۔ جن میں گاڑھا لاہی سیال بھاپ اڑاتا تھا ایسے کہ اس سیال پر جائفل کے کاٹھ کے ریشے بکھرے ہوئے اور سرخ رنگ تلچھٹ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔

اماں زیتوبیہ نے گھر پر ایک چھوٹے سے جشن کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں سیرین اپنی والدہ کے ساتھ کافی دیر سے شامل ہوئی تھی۔

وہ xhubleta (ایک روایتی لباس) زیب تن کیے ہوئے تھی اور پیاری لگنے کی ساری حدوں کو پھلانگ کر آئی تھی۔ اس نے ماتھے پر سوکے (سرمے کی لکیر) کے تین خط اس احتیاط سے کھینچے تھے کہ تینوں لکیروں کے درمیانی فاصلے میں بالشت بھر کر فرق بھی نہیں آیا تھا اور ان کے اوپر "سرسری" (ماتھے کا زیور) اپنی جھالر پھیلا رہا تھا۔

خود شہرام opinga (مکمش سے بنے البانی چمڑے کے جوتے) qeleshe (ٹوپی) اور fustanella (روایتی لباس) میں بائرن (شاعر) کے پورٹریٹ کی عکاسی کر رہا تھا۔

تالی پیٹتی اماں زیتوبیہ آج خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ ان کی نظریں رقص کے بجائے باری باری شہرام اور سیرین کا طواف کر رہی تھیں۔

طامیر کی منگیتر راحانہ دائرے کی صورت میں مشہور روایتی رقص کر رہی تھی اور اسی گول دائرے میں ٹھس ٹھنسا کر طامیر بھی راحانہ کی سہیلیوں کے ساتھ پرویا ہوا محو رقص تھا۔

بڑے گہرے سرخ قالین پر شہرام اور سیرین ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے بالکل سامنے ولائی حسنی اپنی چوب دار آنکھوں سے سارے منظر کو بنا تاثرات کے گھور رہا تھا۔ شہرام کو حسنی کے رویے میں بڑی سرد مہری نظر آئی تھی۔ وہ پہلے سے ہی کم گو تھا، لیکن اتنا زیادہ نہیں۔۔۔ ساڑھے تین سال پہلے تیرانا (شہر) میں مدر ٹریسا ایئرپورٹ پر شہرام کو الوداع کہتے ہوئے انہوں نے کسی قدر شوخی سے شہرام کی کمر پر دھپ مارتے ہوئے کہا تھا۔

"یار واپس آکر بتانا ضرور کہ یہ انگریزنیاں واقعی میں خوب صورت ہوتی ہیں یا صرف کہانیاں ہی بنی ہوئی ہیں۔" حسنی ہنسا تھا اور شہرام کے کان کی لوئیں سرخ ہو گئی تھیں۔

اب پندرہ دن کے ٹور پر آتے وقت وہ اپنی یونی ورسٹی کے چھوٹے بڑے کتنے ہی قصے اکٹھے کر کے لایا تھا۔ ولائی حسنی کو سنانے کے لیے۔

لیکن ساڑھے تین سال کے اس عرصے نے دونوں میں وہ تکلف قائم کر دیا تھا' جسے ختم کرنے میں اگلے دس سال بھی ناکافی تھے۔

"ولائی۔۔۔" شہرام' حسنی کو دوبارہ بلا رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ بولو۔۔۔" وہ بنا چونکے بولا۔

"آپ کا قہوہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"میں ٹھنڈا ہی پیتا ہوں۔۔۔ تم اپنے قہوے کی فکر کرو۔" وہ سرد مہری سے بولا۔

"کمال ہے۔۔۔ قہوہ تو گرم پینے میں ہی مزا آتا ہے۔ آپ نے ٹھنڈا کر کے پینے کا اصول کہاں سے اپنا لیا؟"

"تم۔۔۔ اب تم مجھے بتاؤ گے اصول۔۔۔"

"میں نے تو ویسے ہی کہا ہے ولائی۔"

"تم اپنے کام سے کام رکھا کرو شہرام۔۔۔ اپنی پڑھائی

کا رعب مجھ پر ڈالنے کی کوشش مت کرنا۔" اس کی آواز کافی تیز ہو گئی تھی۔ اماں زیتو بیہ تالی بجانا بھول گئی تھیں۔ رقص کرتے کرتے طامیر بھی نہ جانے کیوں ساکت ہو گیا تھا۔ شہرام کے چہرے پر سیاہ رنگ آکر ٹھہر گئے تھے۔

"گانے کی آواز تھوڑی تیز کرو شہرام۔" بابا زلاری درمیان میں بولے تو سب کی توجہ ہٹی تھی۔

"دیکھو تمہارا دوست کیسا لطف لے رہا ہے.... اور تم کب سے یہاں ہی بیٹھے ہو۔" اماں زیتو بیہ نے جیسے اسے ترغیب دی تھی۔

"آؤ سیرین! ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔" شہرام اٹھا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ سیرین کی طرف بڑھایا تھا۔

سیرین اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔

"واپس بیٹھ جاؤ شہرام! میرا رقص کرنے کا بالکل بھی ارادہ نہیں ہے۔" سیرین اپنی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ "میں ابھی پیچھے سے آ رہی ہوں۔ اور کافی تھک چکی ہوں۔"

"راحافہ کا گھر تمہارے گھر سے بھی کافی دور ہے سیرین۔ لیکن اسے۔"

"مجھے مزید بھوک نہیں ہے۔ میں اپنے کمرے میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔"

شہرام کی بات مکمل ہونے سے پہلے اور سیرین کے جواب دینے سے پہلے حسنی کسی کل دار پرزے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

"بھوک نہیں ہے تو ویسے ہی بیٹھ جائیں ولائی۔"

"جشن کا اہتمام تمہارے لیے کیا گیا ہے شہرام۔" اس کے لہجے سے طنز کا عنصر پھوٹتا تھا۔ "میرے لیے نہیں۔ کھل کر انجوائے کرو۔"

رومال سے اپنے ہونٹوں کے کونے صاف کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔ اور ارادتاً اس کی نظر شہرام کے دائیں طرف جا کر ساکت ہو گئی تھی پھر وہ اسی طرح اپنے ہونٹ صاف کرتا کمرے میں چلا گیا تھا شہرام کے دائیں طرف سیرین بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے ماتھے پر سوکے کی تینوں لکیریں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔

شہرام واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور دائیں طرف سیرین کے کان کے قریب چہرہ لاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

"ولائی حسنی کو تم سے شرم آتی ہے شاید۔ پتا نہیں ہمارے شادی کے بعد ان کا کیا حال ہوا کرے گا۔"

سیرین کا رنگ ایک دم پیلا پڑا تھا۔ شہرام جھینپ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سیرین کافی سے زیادہ شرمیلی ہے۔ اور ایسے میں "ہماری شادی" کے الفاظ نے اس پر کیسے اثر کیا تھا۔ اس بات کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

طامیر اپنی منگیتر کے پاس تھک کر بیٹھ گیا تھا اور میوزک ہلکا کر دیا گیا تھا۔

"اب جلد ہی حسنی کی بھی شادی کر دینی چاہیے۔"

"وہ مانے بھی تب نا۔" اماں زیتو بیہ نے جواب دیا تھا۔

"سیرین! بھائی کے لیے تم کوئی لڑکی ڈھونڈو نا۔ بالکل اپنے جیسی۔ تمہاری پسند کو وہ انکار نہیں کریں گے۔" شہرام نے سیرین سے کہا تھا اور تب ہی بے اختیار شہرام کی نظر سیرین کی گردن پر پڑی تھی۔ وہاں سے نظر ہٹا کر بری طرح سے پھر اس نے سیرین کے ہاتھوں کو ٹٹولا تھا اور جیسے رات کے اکلوتے راجا چاند کا سنگھاسن بھی اختتام پذیر ہو گیا تھا۔

بابا زلاری بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور اماں زیتو بیہ سیرین کی والدہ کے ساتھ کچن میں گم ہو گئیں۔

"تم نے ہماری منگنی کی انگوٹھی نہیں پہنی سیرین۔"

اکیلے ہونے پر بہت دیر کی روکی ہوئی بات کو شہرام نے ادا کیا تھا۔ اس کے لہجے میں سرسری پن نہیں تھا بلکہ ایک طرح کی جواب طلبی تھی۔

"وہ ذرا ڈھیلی تھی۔ میں نے سوچا کہیں گر ہی نہ جائے۔"

"تمہیں اس پر دھاگہ باندھ لینا چاہیے تھا۔ آج کے دن کے لیے تم اتنا بھی تردد نہ کر سکیں۔"

"تم اس طرح اچانک آئے ہو شہرام کے کسی بھی چیز کے اہتمام کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔"

"اور وہ تعویز جو میں نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر تمہیں پہنایا تھا۔ وہ بھی تمہارے گلے میں نہیں ہے۔ کہیں تم اسے کھو تو نہیں چکیں۔"

"نہیں۔ وہ میرے پاس ہے، لیکن میں اسے ہر وقت نہیں پہن سکتی۔ میں لیٹتے وقت الجھن کا شکار ہو جاتی تھی۔ گلے پر باقاعدہ ایک زخم سا بن گیا تھا۔"

ان دونوں جوابوں نے شہرام کو افسردہ کر دیا تھا۔

وہ تعویز امریکہ جانے سے پہلے اس نے سیرین کو دیا تھا۔

صندل کی لکڑی کا وہ دو انچ کا ٹکڑا آدھ انچ موٹا تھا اور اس ٹکڑے کے ایک آدھے کونے میں سوراخ کر کے موٹی کالی ڈوری اس طرح ڈالی گئی تھی کہ سامنے اور پشت سے ڈوری نظر نہیں آتی تھی۔ اور یہ ڈوری ساکن لکڑی میں سے درخت کی شاخ کی طرح پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

بابا زلاری نے تعویز کو بڑے دنوں کی خاص توجہ اور دلی محبت کے بعد تکمیل تک پہنچایا تھا۔

ndoc Martini (البانی مصور) کا ایک گمنام اور بے نام پورٹریٹ جو بابا زلاری کو بے انتہا پسند تھا اور جسے وہ اتنی بار بنا چکے تھے کہ اس کی ایک ایک لکیر حاشیہ انہیں ازبر ہو چکا تھا۔ کو تعویز کے سامنے کی طرف کندہ کیا گیا تھا۔

ایک آٹھ نو سال کی بچی جو اپنے ننھے ہاتھ کے مکے کے اوپر تھوڑی ٹکائے اپنی آب دار آنکھوں میں کسی اجنبی جذبے کا انتظار لیے نجانے کس طرح دیکھتی نظر آتی ہے۔

"بابا! اس تعویز کے پیچھے ایک تحریر بھی ابھار دیں۔"

شہرام نے چھوٹی ریتی لیے تعویز پر جھکے بابا زلاری سے کہا تھا۔

"کیا۔؟"

"یہ۔ یہ کہ۔" اس نے تھوڑی دیر توقف کیا۔

"یہ کہ۔ تم سے جدائی ہوئی تو میں مر جاؤں گا۔"

کام کرتے بابا زلاری نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگے تھے۔

شہرام شرمندہ ہو گیا تھا۔

"آپ نہیں لکھیے۔ میں خود ہی لکھ لوں گا۔"

شہرام کی خفگی سے پر شکل دیکھ کر وہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"تم ابھی بچے ہو شہرام۔ ورنہ یہ بات جان چکے ہوتے کہ کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔ سب جیتے ہیں۔ زندگی بڑی ٹھوس اور ڈھیٹ ہے۔ یہ ہر حالات میں گھسٹتی ہے۔ اور دوسری بات۔ ہم جن کے بغیر جی نہیں سکتے ان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر وہ ہم سے محبت کرتے ہیں تو اس بات کو بخوبی جانتے ہیں۔" بابا زلاری نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

تعویز مکمل ہوا تو وہ کتنی ہی دیر اس پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا سکا تھا۔ وہ تعویز لکڑی کا تھا لیکن سونے کی طرح چمکتا تھا۔ "لاکھ" نے اس میں دھوپ کی سی لشک پیدا کر دی تھی۔ پورٹریٹ اس قدر مہارت سے بنایا گیا تھا کہ صرف دھڑکنوں کی کمی رہ گئی تھی۔ اور آج سیرین کے دونوں جوابوں نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔

اگر واقعی ایسا ہی تھا جیسا وہ کہہ رہی تھی تو پھر اس کے چہرے کے تاثرات نے اس کی بات کا ساتھ کیوں نہیں دیا تھا۔

گھر سے باہر سیرین کو الوداع کرتے وقت اسے اپنی بات کا جواب مل گیا تھا۔

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں شہرام! نجانے تم اسے کس تناظر میں پرکھو، لیکن ٹالنے کا اب کیا فائدہ۔ تم اچانک آ ہی گئے ہو تو میں بھی بتانے کے لیے پھر تمہید نہیں باندھوں گی۔"

سیرین اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوجے میں پھنسائے تذبذب کا شکار تھی۔ اس کا سارا حسن ایک دم ہی ماند پڑ گیا تھا۔

"میں آج بھی یہاں آنا نہیں چاہتی تھی، لیکن ایک بار تو آنا ہی تھا۔ ایک بار تو تم سے ملنا ہی تھا۔"

"کیا بات ہے سیرین۔ کہہ دو جو کہنا ہے۔"

شہرام نے کہا تو نظریں اٹھا کر سیرین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"تمہاری پسنائی انگوٹھی اس قدر ڈھیلی ہو چکی ہے کہ اب وقت کا کوئی بھی دھاگہ اسے ٹھیک نہیں کر سکتا۔"

"کیا مطلب سیرین۔ اس بات کا آخر کیا مطلب ہے؟" شہرام حیران ہوا تھا۔

"وہ ہی مطلب شہرام جو تم سمجھ چکے ہو۔ لیکن ماننا نہیں چاہ رہے۔"

"نہیں میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ خدارا مجھے سمجھاؤ سیرین۔"

"سیرین بیٹا! جلدی آجاؤ۔" خالہ فیرن کی آواز آئی تھی۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھی سیرین کا انتظار کر رہی تھیں۔

"ہو سکے تو مجھے بھول جانا شہرام۔!" سیرین نے کہہ کر شہرام کے فق چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔



خاموشی اور اندھیرے میں ساعت دو آتشہ ہو چکی تھی۔ فون در فون (سانپ کی پھنکاروں) کو بیانکا نے اپنے کانوں میں چنگھاڑتے سنا تھا۔ ضیاد یز (روشنی دینے والا) کی کرم نوازیاں کہیں جا چھپی تھیں اور سبت سرگ (چھ اطراف) سیاہ چادریں اوڑھے ماتم کناں تھے۔

وہ پہلی سیڑھی پر ایسے بیٹھی تھی جیسے بگڑے نیل کے ماٹ کے پیندے میں بیٹھی ہو اور اس کے بارے میں غلط افواہیں بس پھیلنے ہی والی ہوں۔

تہہ خانے کے دروازے سے ہاتھ ہٹا کر اس نے سارے واقعے کو از سر نو یاد کیا تھا۔ ان کاغذات پر دستخط کرو۔ اور باقی کے سارے پروسیجو تک ہماری مہمان بن کے رہو۔ دروازہ نہیں کھلے گا۔"

حیفہ مام کے کندھے کے پیچھے سے وہ ان پانچوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب تایا غفار نے ان کے آگے تین چار کاغذوں کو لہرایا تھا۔

بنا پڑھے ہی وہ جان گئی تھیں کہ وہ کس طرح کے کاغذات تھے وہ جائیداد کی منتقلی کے کاغذات تھے۔

بیانکا کا دل چاہا ان پانچوں کے منہ پر تھوک دے۔ یہ لوگ کس قدر پیچ ہو چکے تھے۔

"خود کو مت تھکاؤ۔ یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔ نہ ہی ٹوٹے گا۔"

"آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا کہ میری بیٹی ان کاغذات پر دستخط کر دے گی۔"

"یہ ہمارے بھائی کی جائیداد ہے۔ جو اس نے بہت محنت سے بنائی ہے۔ اس جائیداد پر تم دونوں ماں بیٹی کو ہم ہرگز قابض نہیں ہونے دیں گے۔"

"یہ میری بھی جائیداد ہے۔"

حیفہ مام چلائی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ ان سب کے چہرے نوچ لیں۔

"تمہارے نام والے اپارٹمنٹ کی تو ہم بات ہی نہیں کر رہے۔ نہ ہی تمہارے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے دس ہزار ڈالر کی۔"

حیفہ مام ان کی درست معلومات پر دنگ رہ گئی تھیں۔ اتنے درست اعداد و شمار۔ وہ لوگ یقیناً" کافی عرصے سے اس چیز کے منصوبے بنا رہے تھے۔

"جو کچھ بیانکا کے نام منتقل ہوا ہے۔ ہم صرف وہ چاہتے ہیں۔"

"آپ سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" بیانکا بھی چلائی تھی۔

"چلو' ایسا ہی سمجھ لو۔ اب جلدی سے ان سب کاغذات پر دستخط کر دو۔ آج کرو گی تو مزید پندرہ دن تمہیں اور یہاں رکنا پڑے گا۔ جتنے دن انتظار کرواؤ گی۔ تمہارا ہی نقصان ہو گا۔"

"میں ان پر سائن نہیں کروں گی۔"

"یہ تمہاری بھول ہے۔ تم ہمیں نہیں جانتیں۔" چچا جلال نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ مزید حیفہ موم کے وجود میں سمٹ گئی تھی۔

"الیاس کو اندازہ بھی نہیں ہو گا کہ اس کے بھائی

کیسے سانپ ہیں اور ان کی بیویاں۔"

"پھر تم اس بات کو جلد ہی قبول کرلو۔ اور ہم کچھ برا نہیں کر رہے۔ اپنے بھائی کی جائیداد ہی تو مانگ رہے ہیں۔"

"اس بھائی کی بیٹی ابھی زندہ ہے۔"

حیفہ مام نے چلا کر پھر وہی بات کی تھی جو وہ پہلے بھی کہہ چکی تھیں۔ اور جس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"وہ بیٹی خود سر ہو چکی ہے۔ اپنی ماں کی طرح۔ تب ہی تو ہمیں یہ طریقہ کار اپنانا پڑ رہا ہے۔"

"آپ سب کس خام خیالی میں ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ چاہے ہم دونوں کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

"اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" تایا غفار کی بات میں گھمنڈ تھا۔ بیانکا کو ان کے گھمنڈ پر ہنسی آئی تھی۔

"آخری بار پیار سے کہہ رہا ہوں۔ ان کاغذات پر دستخط کردو۔ ورنہ۔"

"ورنہ۔ کیا۔ کیا کریں گے آپ۔" حیفہ موم نے چلا کر پوچھا تھا۔

پانچوں خاموش ہو گئے تھے۔ یہ خاموشی پاتال کے اس زلزلے کی طرف اشارہ کرتی تھی جس کا بہاؤ رفتہ رفتہ زمینی سطح تک آرہا ہو۔

حیفہ مام کی آنکھوں میں اپنے ارادے کی پختگی تھی اور ان سب کے چہروں پر کچھ کر گزرنے کی جرات چمکتی تھی۔

پھر دھماکے دار گرج کے ساتھ آتش فشاں پھٹ پڑا اور ہر چیز پر پٹھورائی (چولہے کی جلی ہوئی مٹی والا) رنگ چھا گیا۔

پانچوں نے ان دونوں کو پکڑ کر گھسیٹا تھا نجانے کس سمت۔ وہ اپنا آپ بچانے لگیں، لیکن پانچوں کے مضبوط ارادوں اور زور آزما ہاتھوں کی گرفت کسی آہنی شکنجوں کی طرح تھی۔

بے اختیار ہو کر بیانکا نے چلانا شروع کر دیا، اور تایا غفار نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے سفید گالوں پر جڑ دیا تھا۔

"چپ کر . . . . !" اسے اس لفظ کا مطلب نہیں پتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اسے کوئی غلیظ گالی دی گئی ہے۔

شہناز اور فیروزہ نے دونوں کے پرس چھین لیے تھے اور اس چھینا جھپٹی میں حیفہ مام کی شال بھی اتر گئی تھی۔

چچا جلال نے اسے بالوں سے پکڑ کر تہہ خانے کے اندر دھکیلا تھا۔ ان کا چلانا، کراہنا۔ التجا کرنا۔ انہیں شرم دلانا اور خدا کے واسطے دینا سب بے کار ثابت ہوا تھا۔

"اب یہاں بیٹھ کر تسلی سے سوچو کہ تمہیں دستخط کرنے ہیں کہ نہیں۔" تہہ خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے جلال نے کہا تھا۔

تیز روشنی سے اندر آنے کے باعث پہلے پہل تو اسے کچھ نظر ہی نہیں آیا تھا۔ پھر جب رفتہ رفتہ بصیرت نے کام کرنا شروع کیا تو وہاں تاریک در و دیوار کے علاوہ اسے کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔

اس اندھیرے میں ایک چیز چمکتی تھی۔ اور وہ حیفہ مام کی آنکھوں میں آئے آنسو تھے۔



چوبی دروازے کو پیٹتے پیٹتے اس کے اپنے ہاتھ ساگوان کی لکڑی کی طرح سن اور ٹھوس ہو چکے تھے۔ اور ان میں خون کی گردش اپنی سرسراہٹ تک محسوس نہ کرواتی تھی۔

وہ تھک چکی تھی، لیکن پھر بھی دروازہ پیٹتی رہی اور اول فول بکتی رہی۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ انہیں۔ انہیں امریکہ جیسے ملک میں۔ کسی تہہ خانے میں بند کر دیا گیا ہے۔ تمسخرانہ ہنسی ان لوگوں کے انجام کو تصور میں لاتے ہی اس کے اندر کہیں دبی ہوئی تھی۔

"یہ لوگ نہیں جانتے کہ انہوں نے کتنی بڑی بے وقوفی کی ہے۔ اس قبیح حرکت کا سنگین خمیازہ انہیں

جلد ہی بھگتنا پڑے گا۔ یہ امریکہ کو پاکستان سمجھ بیٹھے ہیں۔" اس کا دل کیا کہ وہ ان لوگوں کی کم عقلی پر ماتم کرے۔

"یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح یہ اپنی بات منوالیں گے۔"

غصے سے اس کی نسیں تن گئی اور وہ مزید زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔

"تمہارے باہر جانے پر پولیس ان کا کیا حشر کرے گی۔ یہ لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" بیانکا کو ان سب کی آنے والی حالت پر ترس آنے لگا۔

"الیاس۔! الیاس ان لوگوں سے کتنا پیار کرتا تھا۔ اور یہ سب کیسے ابلیس صفت۔ کیسے کر یہہ نکلے۔"

حیفہ مام نے رندھی ہوئی آواز میں خود سے کہا تھا۔ وہ چوکور تہہ خانے کے کونے میں ایک لحاف کے اوپر بیٹھی تھیں۔ اور ان کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ بیانکا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ انہیں چپ کروائے، دلاسا دے۔ وہ گھنٹوں دروازہ پیٹنے سے فارغ ہونے والی نہیں تھی۔

پھر دروازہ ایک بار پھر کھل گیا۔

اندھیرے تہہ خانے میں روشن چچا جلال کا چہرہ نظر آیا۔ ان کے پیچھے دوسرے بھی سب کھڑے تھے۔ چچا جلال نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔

"جلد ہی عقل آ گئی۔" انہوں نے کہا۔

بیانکا کو وہ چہرے تیزاب سے جھلسے ہوئے نظر آئے تھے۔

تایا غفار نے دوبارہ اس کے آگے کاغذات کیے تھے۔ بیانکا نے وہ کاغذات پکڑے تھے۔ غفار نے اسے پین پکڑانا چاہا تھا۔ لیکن تب تک بیانکا کاغذوں کو دو ٹکڑوں میں پھاڑ چکی تھی۔ اور وہ چار ٹکڑوں میں بٹے کل سولہ پرزے اس نے تایا غفار کے منہ پر دے مارے تھے۔

"تھو۔!" تایا غفار نے پہلے زینے پر دروازے کی دہلیز کے پار تھوکا تھا۔ اور دروازہ دھڑام سے دوبارہ بند کر دیا گیا تھا۔

وہ بڑی دیر تک وہیں بیٹھی اس تھوک کو گھورتی رہی تھی۔

حیفہ مام کے رونے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔

بیانکا نے اب دوسرے رخ پر سوچنا شروع کیا تھا۔ یہ بات ہضم کرنے اور ماننے میں تو اسے بہت دیر ہو گئی کہ وہ حیفہ مام کے ساتھ کسی تہہ خانے میں قید کر دی گئی ہے۔ وہ اس حرکت کو ان لوگوں کا بچپنا تصور کر رہی تھی اور جب اسے اپنے اور حیفہ موم کے تہہ خانے میں بند ہو جانے کا یقین ہو گیا تو اس نے نئی نئی خام خیالیاں پالنی شروع کر دی۔

جیسے ابھی کوئی ہاتھ معجزاتی طور پر انہیں یہاں سے نکال لے گا۔ پولیس کو اپنے آپ ہی خبر ہو جائے گی۔ اور وہ برق رفتاری سے دونوں کی مدد کرنے یہاں پہنچ جائے گی۔ ارد گرد کے دور نزدیک کے مکان والوں کو غفار، جلال، شہناز، فیروزہ، احمد کے ظلم کا علم ہو جائے گا اور سب مل کر بیانکا اور حیفہ مام کی خاطر تہہ خانے کی دیواریں تک توڑ ڈالیں گے۔

اس نے سیڑھی سے اتر کر پہلی بار تہہ خانے کا جائزہ لینا شروع کیا تھا۔ وہ ایسے رعب سے تہہ خانے میں چل رہی تھی جیسے جلد ہی کسی بادشاہی کرسی پر بیٹھ کر اوپر والوں کے لیے دار پر لٹکانے کا حکم صادر کرنے والی ہو۔

اس تہہ خانے میں ان سے پہلے یقیناً" لکڑیاں یا کوئلہ رکھا جاتا تھا۔ چھت دیواریں اور فرش بری طرح کالے ہوئے پڑے تھے۔ اور وہاں جیسے برسوں سے صفائی نہیں کی گئی تھی۔ سمبل لکڑی کے چھوٹے بڑے ریشے سارے فرش پر جا بجا بکھرے ہوئے تھے کونے میں ایک غسل خانہ نو تعمیر شدہ تھا۔ کیونکہ اس کی دیواروں کا پلستر ابھی تازہ تھا اور دوسری دیواروں سے مختلف بھی۔

"تو ان حبشیوں نے انہیں قید کرنے کا منصوبہ یہاں بلانے سے پہلے ہی بنا رکھا تھا۔" اس نے سوچا اور ان کے انجام پر ہنسی۔

"یہ لوگ وہ گناہ کر رہے ہیں جس کا کفارہ ان کی

آنے والی کئی نسلیں ادا کرتی رہیں گی۔" وہ دوبارہ ہنسی۔ غسل خانے کی دیوار میں چھت کے بالکل قریب ایک گول روزن تھا۔ بیانکا ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی۔

روزن کو دیکھ کر سوچتے ہوئے وہ جس غلط فہمی میں تھی، وہ غلط فہمی اگلے دن دور ہوئی تھی۔ پوری طرح سے۔



صنوبر اور دیودار کے دیو قامت درختوں کی ڈالیوں اور پتوں سے چھن کر آتی دھوپ دھرتی کے پرپیچ سینے پر بڑے بے ڈھنگے نقش و نگار بنا رہی تھی، لمحوں میں پہاڑی گستاخ ہوا کی ہلکی سی لرزش ان نقوش کو بگاڑ کر دوبارہ ایک نئی طرز پر مرتب کرنے پر ٹھن جاتی تھی۔ ڈیزائن کے جوڑوں پر آرو ہی (راگ میں رائج ایک طریقہ) کی گانٹھیں کسی تھیں۔ اور جھرنے کی پھوار اس ملہاری دھن کو اپنے ہمراہ لیے قریب سے گزرتے ست اور خاموش اوس سے بھی زیادہ نزاکت سے بہتی اور ابھرتی جا رہی تھی۔

"بولو سیرین! کیا میں بدل گیا ہوں۔"

شہرام نے کدام کے واحد پیڑ کی چھاؤں تلے پڑے پتھر پر سر جھکائے بیٹھی سیرین سے پوچھا تھا۔

ارجیر کی جامد سرد ہواؤں جنھوں نے اسے کسی بچے کی طرح اپنی گود میں اٹھا کر بھرپور بوسہ دیا تھا انہیں ہواؤں نے اسے منہ کے بل گرانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

جشن کی رات سے اگلے ہی دن وہ سیرین کے گھر گیا تھا... پھر اس سے اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی... وہ جاتا رہا تھا روز بلاناغہ... مسلسل دس دن... اس سے تو جشن والی وہ رات گزارنا ہی مشکل ہو گیا تھا... اور ان دس دنوں نے تو اسے بالکل ہی پاگل کر دیا تھا۔

"وہ گھر پر نہیں ہے... شکودرا (ایک شہر) جا چکی ہے... اپنے ماموں کے پاس... صبح ہی وہاں سے فون آیا... ان کی طبیعت خراب ہے۔" سیرین کی والدہ فیرن نے اسے بتایا تھا۔

"مجھے وہاں کا نمبر چاہیے۔"

"فون ان کے گھر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے... تم فکر نہ کرو... وہ ایک دو دن تک آجائے گی۔"

وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اسے کس چیز کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ وہ ہر روز سیرین کے گھر جا تا رہا تھا۔

"نہیں، وہ آج بھی نہیں آئی..."

"آج بھی نہیں... آج بھی نہیں۔"

وہ کہیں گئی ہوتی تو واپس آتی...

شہرام کو دیکھ کر خالہ فیرن کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی تھی اور خود بخود ہی ان کی آنکھیں جھکنے پر آجاتی تھیں۔

شہرام سوالات کرنے لگتا تھا اسے روز روز کے ان بہانوں پر یقین نہیں آتا تھا اس کا دماغ پھٹنے پر آگیا تھا۔

"کیا وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی؟"

"ایسی بات نہیں ہے... جو میں نے بتایا وہ ہی اصل بات ہے... تمہیں یقین کیوں نہیں آتا..." وہ منہ پرے پھیر لیتیں۔ جیسے اپنے آنسو اس کے سامنے بہانے سے ڈرتی ہوں۔

شہرام جواب میں کچھ نہیں کہتا تھا، لیکن آج وہ خالہ فیرن کو پرے ہٹا کر اندر جانا چاہتا تھا۔

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں... وہ اندر ہے... طامیر نے خود اسے اندر آتے دیکھا ہے۔" اب خالہ فیرن باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

"ہاں، وہ اندر ہے... پر تم سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"میں اس سے خود مل لوں گا۔"

"ٹھہرو... میں اسے بلا کر لاتی ہوں۔"

خالہ فیرن اندر چلی گئی تھیں۔ جب وہ باہر آئیں تو ان کے ساتھ سیرین بھی تھی۔ حد درجہ مطمئن جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

"تم میرے ساتھ آخر کیا کر رہی ہو سیرین؟" اسے دیکھتے ہی شہرام پھٹ پڑا تھا۔ اور وہ ایسے خاموش رہی تھی جیسے کسی کی لاش پر صبر کر کے بیٹھی ہو۔

کدام پیڑ کی ایک موٹی شاخ، چھاؤں کی تاریکی میں

ہونے کے باوجود بھی شہرام کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔
نظر اندازی، ناسپاسی، کراہت یا شاید بے وفائی، وہ سیرین کے رویے کو کس چیز کا نام دیتا۔
اس نے گلاب اور لالے کے ایک ساتھ گندھے پھولوں کو دیکھا۔
محبت اور رقیب۔۔۔
پانچ سال پہلے اس نے اس منظر کو برا شگون جانا تھا اور پھر تب ہی اس نے اپنے خیالات جھٹک بھی دیے تھے۔ آج اسے پھر اس شاخ کے سائے سے خوف محسوس ہو تا تھا۔ سیرین اسی پیڑ کے نیچے ایک بیضوی پتھر پر بیٹھی اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے چیڑ کی نرکونوں اور خشک سوئیاں پتوں کا ڈھیر لگا تھا۔
چمکیلی دھوپ کے ذرے شہرام کے سر پر برس رہے تھے۔ شاید یہ ہی وجہ تھی یا سیرین کا رویہ۔۔۔ شہرام کا سر لحہ بہ لحہ پھٹتا ہی جا رہا تھا۔
"بولو سیرین! کیا میں بدل گیا ہوں۔۔۔ کیا میں اب پہلے جیسا نہیں رہا۔"
"نہیں شہرام۔۔۔ قدرت اور زندگی نے ابھی تمہیں نہیں آزمایا۔۔۔ خوش قسمتی سے تم ویسے ہی ہو۔"
"تو پھر کیا تم بدل گئی ہو سیرین؟" سیرین کی آنکھیں چمک کر بجھی تھیں۔
"بد قسمتی میرے ساتھ تھی۔۔۔ میں آزمائی گئی اور آزمائش پر پوری نہ اتر سکی۔"
"میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا سیرین۔۔۔ ایسا رویہ نہ اپناؤ کہ مجھے کہنا پڑے کہ یہ محبت مجھے لے ڈوبی۔"
"میں کیا کروں شہرام! میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے بہکنا تھا۔ میں بہک گئی۔"
"تم ارجیر میں تھیں اور مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تھیں۔۔۔ تم نے شکور دا جانے کا جھوٹا جواز کیوں گھڑا۔۔۔؟"
"میں چاہتی تھی کہ تم مجھ سے دوبارہ ملے بغیر ہی امریکہ واپس چلے جاؤ۔۔۔ تم واپس چلے جاتے تو یہ سوال وجواب نہ کرتے۔۔۔ بس اس لیے۔"
"تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے بات کیے بنا امریکہ چلا جاؤں گا۔" شہرام نے پوچھا تھا اور سیرین دھوپ میں کھلتی نرکونوں کو دیکھنے لگی تھی۔
"یہ سب کیا ہو رہا ہے سیرین۔۔۔ تم ایسا بھیانک مذاق کیسے کر سکتی ہو میرے ساتھ۔۔۔ ہماری محبت تو بچپن کی ہے۔"
"بچپن کی محبت کتاب کے پہلے ایڈیشن کی طرح ہوتی ہے شہرام۔۔۔ اس میں الفاظ کی بہت ساری غلطیاں نکلنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔۔۔ یہ کتاب پرانی تو ہو سکتی ہے مگر مستند نہیں۔"
"کیا تمہیں وقت چاہیے۔۔۔؟"
"وقت؟ کس لیے؟"
"سوچنے کے لیے۔۔۔ ہمارے بارے۔۔۔ ہمارے تعلق کے بارے۔۔۔ ہماری پرانی محبت کے بارے۔"
"تم وقت دینے پر بضد ہو تو میں لے لیتی ہوں۔۔۔ اگرچہ اب حاجت کسی بھی چیز کی نہیں میری التجا وہی رہے گی۔"
"کیا۔۔۔؟"
"تمہیں بتا تو دیا ہے۔۔۔ پھر کیوں بار بار پوچھ کر مجھے اور خود کو تکلیف دے رہے ہو۔"
"تم التجا بتاتی ہو۔۔۔ لیکن وجہ نہیں۔"
"بے وجہ ہی سمجھ لو۔۔۔ لیکن کیا تم مجھے بھول نہیں سکتے شہرام۔۔۔ آسانی سے ہمیشہ کے لیے اس تعلق کو ہماری محبت کو، منگنی کو جیسے سرے سے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔۔۔ کیا ہم دوبارہ صرف دوست نہیں بن سکتے۔ اچھے دوست بچپن کے۔"
سیرین کہتی چلی گئی اور شہرام کی آنکھوں کے کونوں نے گویا آگ پکڑ لی۔
"ان تین سالوں میں ایسا کیا ہو گیا سیرین؟"
"ہونے کے لیے تو ایک لحہ ہی کافی ہوتا ہے شہرام۔۔۔"
"پہاڑوں کی برف بھی ایک دن میں نہیں پگھلتی۔۔۔ یہ بدلاؤ اتنا بڑا ہے کہ لحوں کی دین نہیں ہو سکتا۔"

"بہت سارے لمحے مل کر اکٹھے ہوگئے تھے...."

"دو ہفتے پہلے جب میں یہاں آنے والا تھا تو سوچتا تھا کہ ارجیر میں کیا کچھ بدل گیا ہو گا۔۔۔ مجھے کچھ بھی بدلا بدلاؤ نظر نہ آیا.... ساری تبدیلیاں اپنی پرانی بنیادوں پر ہی ہوئی تھیں۔"

میں سوچنے لگا ارجیر تو ویسا کا ویسا ہی ہے۔ میں کتنا غلط تھا۔ اب دیکھتا ہوں تو اپنے مشاہدے کی کجی نظر آتی ہے۔ کتنا تو بدل گیا ہے ارجیر۔ انسانوں کے دل بدل گئے ہیں۔"

بڑی دیر تک وہ سستی سے بہتے ہوئے پانی کو جس میں سورج کی کرنیں اپنا مقام تلاش کرتی تھیں، دیکھتا رہا تھا۔ اور بولتا رہا تھا۔

اس بات سے بے خبر کہ اس کی پشت پر بیضوی پتھر پر بیٹھی سیرین اٹھ کر واپس جا چکی ہے۔



کابوسی سانسوں کے ساتھ بدن کو بار بار ہوا کے دوش پر اچھالنے کے عمل سے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا تھا۔ وہ سب اتنا خوفناک تھا کہ اس کے جھوٹ ہو جانے کا اسے منتظم یقین تھا۔ سویدا (آسمان کا قلبی سیاہ نقطہ) سرنگوں کا ایک مہا جال بچھا تھا۔ یہ سرنگیں دائروں میں کھودی گئی تھیں۔ ان کی شروعات اور اختتام ایک ساتھ چل رہے تھے۔ اور وہ اس مہا جال میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

اس گول روزن پر چاند کی روشنی اپنا وقت پورا کر چکی تھی۔

پردہ آفتاب زرد کتان کی طرح چھچھرا تھا۔ سورج کی بنفشی شعاعیں شیشے سے ٹکرا کر واپس پرے لوٹ جاتی تھیں۔ ان شعاعوں کی بہت پتلی دھار تہہ خانے کے اندر اتر رہی تھی۔ یہ روشنی براہ راست نہیں تھی۔ ترچھی اور پھر ترچھی۔ اس روشنی میں کم مائیگی کا احساس غالب تھا۔

حیفہ مام کی آنکھیں تہہ خانے کے نمیالے فرش پر اس تھوڑ دل روشنی کے گول دائرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اڑتی چیل کا سا ایک سایہ تھا جو وقفے وقفے سے اس گول دائرے سے ٹکراتا تھا۔ اور پھر واپس پرے ہو جاتا تھا۔ چیل کے ٹکرانے سے شیشے پر ٹھک کی آواز پیدا ہوئی تھی اور یہ آواز اس تہہ خانے میں فنا ہوئی کسی چڑیل کی کریہہ کی طرح گونجتی تھی۔

کل رات کا بیشتر حصہ وہ اس روزن کی طرف منہ کیے مدد کے لیے پکارتی رہی تھی اس بات سے انجان کہ صدا الصحرا کی آواز جتنی مرضی گونج دار ہو، وہ لاحاصل ہوتی ہے۔ جب چلا چلا کر اس کا گلا بیٹھ گیا تو اسے اندازہ ہوا کہ روزن موٹے بلوری تختے سے ڈھکا ہوا ہے۔

پھر بھی وہ اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔

اس نے تہہ خانے میں چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔ کل شام سے وہ یہ کام کافی بار کر چکی تھی۔ اور ہر بار اسے مایوسی ہی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس پر کمرے کا خالی پن واضح ہو گیا تھا۔ تہہ خانہ کسی بانجھ عورت کی طرح بنجر تھا۔ بستروں، لکڑی کے جابجا بکھرے بھوسے اور ان دونوں کے علاوہ اور کوئی چیز اس کی کوکھ میں موجود نہیں تھی۔ اور شیشے پر مارنے کے لیے کوئی ٹھوس چیز درکار تھی۔

وہ بے چینی سے تہہ خانے میں ٹہلنے لگی۔ ایسے میں اسے حیفہ مام کا اطمینان کھٹکنے لگا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جس پر صبر کر لیا جائے۔ یہ ڈیڈ الیاس کی موت کی طرح کا حادثہ نہیں تھا جس پر رونے، آنسو بہانے کے علاوہ انسان بے بس ہوتا ہے۔ وہ ایک دم سے اتنی صابر اور شاکر کیسے ہوئی تھیں۔ انہیں ہرگز رونا نہیں چاہیے تھا۔ بلکہ کوشش کرنی چاہیے تھی۔ آخر وہ اتنی جلدی پست کیسے ہو گئیں۔ بیانکا کے لیے حیفہ مام کا یہ رویہ بالکل نیا تھا۔ اس نے آج تک حیفہ مام کو اتنا جھکا ہوا محسوس نہ کیا تھا۔

کونے میں دو دیواروں کا سہارا لیے حیفہ مام آدھی باتیں بیانکا سے اور آدھی خود سے کر رہی تھیں۔ اور ان کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"شکر ہے' الیاس کی زندگی میں اس کا اپنے بھائیوں پر سے مان نہیں ٹوٹا۔ ورنہ۔ ورنہ اس نے تو دکھ سے ہی۔" حیفہ مام کہتے ہوئے پھر دکھی ہوئیں اور لحاف میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

تہہ خانے میں چلتے چلتے بیانکا کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ اس نے اسٹریپ کھول کر اپنے دونوں پاؤں جوتوں سے آزاد کیے تھے۔ اور انہیں لکڑی کے بھوسے پر رکھ دیا تھا۔ وہ نازک مزاج بے شک نہیں تھی پھر بھی بہت ساری چھلتوں کو اس نے ایک ساتھ اپنے پیروں میں گھستے محسوس کیا تھا۔ کچھ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا ہلکا ہلکا یقین تھا اور کچھ ان ریشوں کی چبھن۔ وہ سراپا آنسو ضبط کرنے کی علامت بن گئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ بیانکا۔ تمہاری بے چینی مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔ میں صبح ان لوگوں کی پھر سے منت کروں گی۔"

اس نے حیفہ مام کی بات نہیں سنی تھی۔ اس کی نظر اپنی اونچی ہیل والے جوتوں پر تھی۔ روزن کافی اونچا تھا۔ لیکن اس نے کھیلنے سے پہلے ہارنے کا نہیں سوچا تھا۔

اس نے اپنے خیال کو فوری عملی جامہ پہنایا تھا۔ اور اونچی ہیل والے سینڈل کو روزن کے شیشے پر دے کر مارا تھا۔ پانچویں چھٹی دفعہ کے بعد اس کا نشانہ بالکل ٹھیک ٹھیک سہی جگہ پر لگنے لگا تھا۔

اس نے اپنی ساری طاقتوں کو یکجا کر لیا۔ اسے تھکنا نہیں تھا۔ بوجھل نہیں ہونا تھا۔ جاگتے اعصاب کو مرنے نہیں دینا تھا۔ اس کی ہمت لاجواب رہی تھی۔ ساری رات۔

ساتھ ساتھ وہ دوسرے عوامل پر بھی سوچنے لگی تھی۔

کیتھی نے اسے کل فون کیا ہوگا یا آج کرے گی۔ جیسے وہ ہر وقت ہر بات بتانے کے لیے کرتی رہتی ہے۔ اسے فون بند ملے گا۔ حیفہ مام کا بھی۔ وہ پریشان ہو جائے گی۔ گھر آئے گی۔ گھر لاک ملے گا۔ وہ پولیس کو انفارم کرے گی اور پولیس فوراً" یہاں پہنچ جائے گی۔

فرش پر کسی مردہ چیل کی طرح ٹکرا کر گرے ہوئے سینڈل کو واپس اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

لیکن کیتھی کو اس گھر کا پتا کیسے چلے گا۔ اس گھر کا ایڈریس تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ ڈیڈ الیاس کی وفات پر بھی سب لوگ قبرستان ہی آئے تھے۔

سینڈل ایک بار پھر روزن کے شیشے سے ٹکرایا تھا۔ ناکام۔

حیفہ مام کی سہیلیاں۔ ڈیڈ کے فرینڈز' ہمارے اٹارنی' آریز۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے لوگ نظر انداز کر دیں۔ ایک عورت کا اپنی جوان بیٹی کے ساتھ غائب ہو جانا۔ نہیں پولیس ضرور حرکت میں آئے گی اور جلد ہی یہاں پہنچ جائے گی۔

شیشے پر سینڈل کی ضرب نے دوبارہ بڑی گونج دار آواز پیدا کی تھی۔ دونوں نے ضد باندھ رکھی تھی۔ کوئی ٹوٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"اور اگر ان لوگوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا تو۔ نجانے ان لوگوں نے کہاں تک کی اور کب تک کی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔"

پولیس کو حرکت میں لانے کے لیے کم از کم ہفتہ دس دن کا تو انتظار کیا ہی جاتا ہے۔ اور میں۔ میں یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ جلد ہی نکال لوں گی۔ یقیناً" ان لوگوں نے اس چیز کا تصور نہیں کیا ہوگا۔ ان کا خیال ہوگا کہ یہ ہمیں بند کر دیں گے اور ہم بے بس اور لاچار ہو کر ان کی بات مان لیں گے۔ یہ سب منہ کے بل گریں گے۔"

سوچتے ہوئے بیانکا کی اپنی شکل کرخت ہو گئی تھی۔

وہ دیواریں نہیں توڑ سکتی تھی۔ کسی بھی قیمت پر۔ توڑ بھی سکتی تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دیواروں کے پیچھے مٹی تھی۔ اور مٹی میں سرنگ کھودنے کا اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

اس کا دایاں کندھا درد کرنے لگا تھا۔ سینڈل اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا جو دیوار کے ہی کسی حصے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔

"خود کو مت ہلکان کرو بیانکا۔"

حیفہ مام نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ یہ ٹھک ٹھک کل سے ساری رات ان کے دماغ پر بجتی رہی تھی۔

چاند تیرتا تیرتا کہیں بہت دور نکل گیا تھا۔ اور سورج کی الوہی کرنوں نے روزن پر دستک دینی شروع کردی تھی۔

"اس کائنات میں کوئی ایک ایسا بھی ہے جو اس شیشے کے بنا ٹوٹے ہی ہماری پکار کو دنیا کی ساتویں تہہ سے بھی سن سکتا ہے۔ وہ اللہ ہے۔ تم بھی اللہ سے دعا کرو۔ اب وہ ہی ہمیں اس مصیبت سے نکال سکتا ہے۔"

نیم اندھیرے میں اس نے پیچھے مڑ کر حیفہ مام کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر پوری شدت سے سینڈل کھینچ کر شیشے پر دے مارا تھا۔ کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ اگرچہ یہ آواز کانچ ٹوٹنے کی آواز سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی تھی۔

لیکن اس کا دماغ اتنا حاضر ہی کب تھا جو اس بات پر غور کرتا۔ مایوسی میں اس ننھی سی کامیابی نے بیانکا کا چہرہ تمتما دیا تھا۔ کموڈ پر چڑھ کر روزن کی طرف جھانکتے ہوئے بے اختیار ہی اس کی نظر اپنے سینڈل پر گئی تھی۔ سینڈل کو روزن کی روشنی کے آگے کرکے س نے جانچا تھا۔

چمڑے کے نیچے کا مضبوط سول ٹوٹ چکا تھا۔ وہ آواز ہیل ٹوٹنے کی ہی تھی۔ ایک آنسو خود بخود ہی اس کے گال تک بہتا چلا گیا تھا۔

"تم ہاتھ ہلا کر باہر سے کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کرو بیانکا۔"

حیفہ مام نے اس کے کندھے پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر اسے ایک اور راہ دکھائی تھی۔ بیانکا نے اپنی دوسری آنکھ کا آنسو صاف کیا تھا۔

"بستر تہہ کرکے اس کموڈ پر رکھتے ہیں۔"

اس نے کہا تھا اور بستر تہہ کرکے وہ دونوں کموڈ پر رکھنے لگی تھیں۔

نئے کموڈ کے اوپر روئی دار بستروں کا ایک چھوٹا بے ڈھب سا ٹیلہ بن گیا تھا۔ اب اگر وہ اس احتیاط سے چڑھتی کہ ایک بھی بستر نہ گرے تو وہ یقیناً" روزن تک اپنا چہرہ لے جا سکتی تھی۔

"احتیاط سے چڑھو اس پر۔"

ساری احتیاطوں کے باوجود بھی بستر دو بار گرے تھے۔

لیکن تیسری بار بالآخر وہ شیشے کے قریب اپنا چہرہ لے جانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ روزن کی دیوار پر ہاتھ ڈال کر وہ اوپر اٹھی تھی۔ حیفہ مام نے نیچے سے اسے ہر وہ سہارا دے رکھا تھا جو وہ اس عمر اور اس حالت میں دے سکتی تھیں۔

کافی لمحے اسی طرح بیت گئے، لیکن بیانکا کچھ نہیں بولی تھی۔ سورج کی دھوپ رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی پورے جوبن پر آگئی تھی۔

"کچھ ہے۔؟ کوئی ہے باہر بیانکا۔"

حیفہ مام نے پرامید اور کسی قدر نرم آواز سے پوچھا تھا۔

بیانکا کا وجود کسی مجسمے کی طرح ساکت تھا۔

"بولو۔ بیانکا!"

حیفہ مام نے اسے ٹانگوں سے جھنجوڑا تھا۔ مجسمہ بھربھری مٹی ثابت ہوا تھا۔ حیفہ مام ایسا نہ کرتیں تب بھی بیانکا نے نیچے ہی گرنا تھا۔

اس تہہ خانے کا روزن گھر کے پچھلے حصے کی طرف تھا۔

شیشے کے پار دور دور تک بنا پھول والی سورج مکھی کی فصل بچھی ہوئی تھی۔ اور وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔

بیانکا کا دل چاہا کہ وہ اسی طرح گری رہے اور خوب جی بھر کے روئے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ فرش پر پڑی رہی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ واقعی میں قید کردی گئی ہے۔



برشگالی کا دغاباز موسم اپنے عروج پر تھا۔ رات میں خوب بارش ہوئی تھی اور بھیگی چمنیاں رات بھر کالا دھواں اگلتی رہی تھیں۔ پھر صبح کھل کر دھوپ نکلی تھی۔

وہ آتش دان کے اوپر چوبی شیلف پر دھری مختلف چیزوں کو گھور رہا تھا۔

آتش دان کی گپھا کے اندر رات کی جلتی لکڑیوں کی راکھ اور کوئلے کا ایک ڈھیر سا بن گیا تھا۔ قد آدم کھڑکی سے آتی ستمبر کی تیز دھوپ نے فرش پر ایک نئی کھڑکی کو گھڑ دیا تھا۔ اور اس نئی نوزائیدہ کھڑکی کا فریم رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے آتش دان میں پڑی لکڑیوں پر پڑنے لگا تھا۔

وقتی طور پر ادھ جلی لکڑیاں دوبارہ سلگی ہوئی دکھتی تھیں۔ اسے وہیں کھڑے کھڑے جیسے ایک صدی بیت گئی تھی۔

"یہ لو۔" آتے ہی سیرین نے انگوٹھی اور دو انچ کی لکڑی کا ٹکڑا (تعویذ) شہرام کے ہاتھ پر دے مارا تھا۔

"اب میرے گھر مت آنا۔ اب مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔" اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟"

وہ ان دونوں چیزوں کو پہچانتا تھا۔ صرف سیرین کے ردعمل کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"اختتام۔ ہر چیز کا۔ ہر تعلق کا۔"

"یہ اختتام اتنا بھیانک کیوں ہے؟" وہ اپنے ہاتھ میں موجود ان دونوں چیزوں کو دیکھنے لگا تھا۔

"تمہاری وجہ سے۔ تم میری ایک بات نہ مان سکے۔ دیکھو اب ہم دوست بھی نہیں رہے۔"

"جب کوئی مر جاتا ہے تو بیٹھ کر اس کی لاش سے گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ ایک تعلق کو ختم کر کے تم دوسرے تعلق کی آس کیسے لگا سکتی ہو؟"

سیرین خاموش رہی تھی۔

"مجھے ایسا طریقہ بتاؤ سیرین! جس سے تم راضی ہو جاؤ۔ میری محبت تمہارے دل میں دوبارہ بھر جائے۔ تم پہلے والی سیرین بن جاؤ؟"

"خدا کے لیے بس کرو شہرام۔!" سیرین کی آواز سارے کمرے میں پھیل کر پلٹی تھی۔

"دیکھو میری محبت، میرا دل اب بھی ویسا ہی ہے۔ اس میں اب بھی تمہارے نام کی دھڑکن ہے۔ اریجیر کی بارشیں بھی ہر بار ایک جیسی نہیں برستی ہوں گی، لیکن میں تمہارے ساتھ ویسا ہی رہوں گا۔"

"ان باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں شہرام۔"

"میں تمہارے لیے خود کو اذیت دینے پر بھی تیار ہو جاؤں گا اگر اس سے تمہاری خوشی منسوب ہوگی تو۔"

"میری خوشی۔ کیا یہ بات تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ میری خوشی اب تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔"

"کیا میری محبت اتنی بے مول اور کمزور تھی کہ تین سال کی جدائی اس پر اثر انداز ہو گئی۔"

"تم مجھ پر ہر طرح کا الزام دھر سکتے ہو شہرام، مگر اب ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں واپسی کے راستے کھو بیٹھی ہوں۔"

"تمہاری زندگی میں کوئی اور کیسے آگیا سیرین؟"

"مجھے بھی پتا نہیں چلا۔"

"اگر میں ایسا کرتا تو تمہیں کیسا لگتا؟"

"میں۔ میں تم سے کوئی سوال جواب نہ کرتی۔ تمہاری خوشی میں خوش ہو جاتی۔"

"یہ تجربہ بہت بھیانک ہے۔ تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"اور میں کر چکی ہوں۔ اور مجھے کوئی پچھتاوا بھی نہیں۔" اس کے انداز نے باغیانہ پن اختیار کر لیا تھا۔

شیلف کے اوپر لگی Aqim Suloi (البانی مصور) کی پینٹنگ "ڈھلی پاشا" کی نقل کو وہ گھورنے لگا تھا۔ تصویر میں جا بجا بکھرے مختلف رنگ لحہ بہ لحہ سمندری لہروں کی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے اور شہرام خود کو اس سمندری طوفان میں غرق ہوتا محسوس کر رہا تھا۔

"کیا نام ہے اس لڑکے کا؟" بڑی دیر بعد وہ گویا ہوا تھا۔

"وقت آنے پر تم جان جاؤ گے۔"

"کیا تم بھول گئی تھیں کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ یا تم مجھے بھول گئی تھیں۔ میری محبت کو۔"

سیرین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب دنیا کے کسی بے وفا کے پاس نہیں ہوتا' شہرام کو سیرین کی اس خاموشی نے طیش دلایا تھا۔

"بولو۔ جواب دو۔" اس نے سیرین کا بازو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھام لیا تھا۔

"چھوڑو مجھے شہرام۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔" وہ غصے سے تیز ہو کر بولی تھی۔

"ہاں' میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اور میرے پاگل پن کی وجہ صرف تم ہو۔" شہرام نے اس کے بازو کو جھٹکے دیے تھے۔

"سمجھو' میں مر گئی ہوں۔"

شہرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے وہ بولی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟"

اماں زنتوبیہ نجانے کہاں سے نمودار ہوئی تھیں۔ ان کے آگے جو منظر تھا' اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ شہرام نے سیرین کا بازو چھوڑ دیا۔ سیرین نے وہاں رکنے میں ایک لمحے کو بھی گناہ جانا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔ جو کام وہ کرنے آئی تھی وہ ہو چکا تھا' پھر اب رکنے کا کوئی جواز بھی تو نہیں رہا تھا۔

اماں زنتوبیہ' شہرام کی شکل دیکھنے لگی تھیں اور وہ چوبی شیلف پر دھری مختلف چیزوں کو۔۔۔ پھر اماں زنتوبیہ جیسے نمودار ہوئی تھیں ویسے ہی غائب بھی ہو گئیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ ان دونوں کا آپس کا مسئلہ ہے۔

"اگر یہ ایک دوجے سے بے تحاشا محبت کر سکتے ہیں تو لڑ بھی سکتے ہیں۔" وہ زیادہ دن تک اس غلط فہمی کی حقیقت سے انجان نہیں رہنے والی تھیں۔

شہرام وہیں کھڑا رہا تھا۔ دھوپ کھڑکی کا فریم بڑھتے بڑھتے شیلف کو جا لگا تھا۔ شہرام آج یہیں رات کر دینے والا تھا۔ شیلف پر دھری مختلف چیزیں دھوپ کی زد میں آنے لگی تھیں۔

شیشم کی لکڑی کا ایک گولڈن ایگل (البانی علامت) بابا ذلاری کے ہاتھ کا بنا ہوا جس کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ اطراف میں دو یونانی گلدان تھے جو بنا پھولوں کے بھی بہت خوب صورت دکھتے تھے۔ اور چند خاندانی تصویروں کے فریم۔

ان ہی چیزوں کے درمیان ایک خنجر بھی پڑا ہوا تھا۔ پندرہویں صدی کے دور کا اور جس کا اسٹینڈ سنگ یشب کا تھا۔ شہرام نے شیلف سے وہ خنجر اٹھالیا' اور اسے میان میں سے نکال کر غور سے اس طرح دیکھا جیسے وہ آج کہیں اچانک سے اس گھر میں آگیا ہو۔

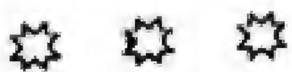
کھڑے کھڑے فیصلہ کر لینے کے بعد شہرام نے اس خنجر کو اپنی نبض پر چلایا تھا۔ خنجر کی دھار تیز نہیں تھی۔ ایک سرخ لکیر اس کی کلائی پر بنی تھی جو فوراً" ہی معدوم بھی ہو گئی تھی۔ بددل اور مایوس سا ہو کر اس نے خنجر کو دوبارہ میان میں ڈالنا چاہا تھا۔

خنجر پرانا تھا یا میان کے اندر کوئی زنگ تھا۔ خنجر نے میان میں جانے سے جیسے انکار کر دیا تھا۔ وہ بڑی دیر اس کے ساتھ زور آزمائی کرتا رہا۔ پھر اسے سالوں پہلے سنی ایک روایتی بات یاد آئی تھی۔

"خنجر میان میں سے نکل تو اپنی مرضی سے آتا ہے۔ لیکن پھر یہ شب خون مارے بغیر واپس میان میں نہیں جاتا۔"

یہ بات یاد آتے ہی اس نے خنجر کو اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔

آنکھوں میں کسی خوفناک ارادے کی پختگی لیے وہ وہاں سے باہر نکلتے ہوئے سوچنے لگا تھا کہ یہ خنجر "سان" پر تیز ہو گا یا "سلی" پر۔؟



مالکوسی (رات کے راگ) میں بہا کے عیاں راز

دفن تھے۔ دور و نزدیک میں موجود ہلکی لرزشیں بھی بلند بانگ صدائیں بن گئی تھیں۔ پشت در پشت سے چلی آرہی زمین کے اندر لاکھوں کروڑوں کہانیاں حنوط تھیں۔ ظلم کی کہانیاں۔ ناانصافی کی داستانیں۔ ہوا میں گھوڑوں کے سموں اور تیر کے پیہم کی آواز تھی۔ اس نے کسی تیر سے بچنے کے لیے خود کو نہیں بچایا تھا۔ وہ بے خوف ہو چکی تھی اور پست بھی۔

وہ بستر پر چت لیٹی تھی۔ اور راکھ زدہ فرش پر پڑے لکڑی کے ریشوں سے کھیلنے میں مصروف تھی۔ وہ بھی بھوسے کو چن چن کر اکٹھا کرتی۔ کبھی انگلی سے گول دائرے بناتے بناتے انہیں دوبارہ بگاڑ کر رکھ دیتی۔

حیفہ مام کب سے اس کا یہ کھیل دیکھ رہی تھیں۔ پورا کمرہ باتھ روم کے تعفن سے بھرا ہوا تھا۔ بدبو کی نکاسی کے لیے سیڑھیوں کے ساتھ درز کے علاوہ اور کوئی درز نہیں تھی' بیانکا کی گھٹن رفتہ رفتہ بڑھتی جارہی تھی' لیکن وہ اپنے چہرے سے کسی طرح کا تاثر نہیں دے رہی تھی۔ حیفہ مام بھی بری طرح کھانسنے لگی تھیں۔ یہ کھانسی انہیں تہہ خانے میں دوسرے دن سے شروع ہوئی تھی اور آج چھٹا دن تھا۔ ان کی کھانسی اب انہیں لمحوں میں نڈھال کردیتی تھی۔ اس کے باوجود ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے ہوئے بیانکا پر پھونکتی رہتی تھیں۔ انہیں بہت سے ورد یاد تھے۔ مصیبت سے نکالنے والے۔ مشکل دور کرنے والے۔ وہ ان وردوں کو پڑھنے کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ بیانکا نے بھی فرار کی ساری راہیں تلاش کرنا چھوڑ دی تھیں۔ ان کو بند کرنے کے لیے اس قدر منصوبہ بندی کی گئی تھی کہ اب باہر والوں کو کوئی جادوگر ہی ان ماں بیٹی کی اس تہہ خانے میں موجودگی کے بارے میں بتاسکتا تھا۔

"بیانکا اٹھو۔ کھانا اٹھاؤ وہاں سے۔" حیفہ مام نے بیانکا کو بلایا تھا۔ وہ کب سے ایسے ہی دونوں ہاتھ کھول کر بنا لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ حیفہ مام کا دل بند ہونے لگا تھا۔ ان دنوں کی تلخی اس کی ساری زندگی گھنا سکتی تھی۔

بیانکا نے سنا' لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی۔ حیفہ مام کھانستے ہوئے خود ہی اپنے بستر سے باہر نکلی تھیں۔

ہر چیز کو بہت ترتیب سے چلایا جارہا تھا۔

کھانا رکھنے کے لیے بھی تہہ خانے کے دروازے کو پورا نہیں کھولا جاتا تھا۔ بلکہ نچلی تختی ہٹا کر کھانا سیڑھی کے پہلے زینے پر رکھ دیا جاتا تھا۔ کھانے کے لیے برتن بھی ڈسپوزیبل تھے تاکہ دھاتی یا کسی بھی طرح کے دوسرے برتنوں سے وہ کوئی کارروائی نہ کرسکیں۔

شروع کے دنوں میں بیانکا نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ لیکن یہ اذیت اپنے ہی خلاف جنگ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھی اگر انہیں اس کی یا حیفہ مام کی ذرا سی بھی پروا ہوتی یا وہ ان دونوں کے لیے ترس' رحم کا جذبہ رکھتے تو نوبت یہاں تک آتی ہی نہ۔

لیکن ساری بازیاں ہار جانے کے باوجود بیانکا کھانے کو حرام تصور کرکے کھاتی تھی۔ احمد کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے اور وہ ایسی دوائیوں کے بارے میں بھی جانتی تھی' جس کے روزانہ کے استعمال سے انسانی اعصاب بالکل ست اور ڈھیلے پڑجاتے ہیں۔ اکثر پولیس اور خفیہ انویسٹی گیشن والے ان ادویات کا استعمال قیدیوں پر کرتے ہیں۔ اور ان سے انہیں یقیناً" کافی مدد ملتی ہے۔

بیانکا کو شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ ان کے کھانے میں بھی ایسی ہی دوائیاں شامل کی جاتی ہوں گی۔ تاکہ جلد ہی وہ ان کے آگے سرینڈر کردیں یا وہ مزید مضبوط نہ رہ سکے۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ایمل رضا

آخری ساحل

وہ دلہن کے لباس میں تھی اور بدحواس سی گاڑی سے اتر کر بھاگتی ہوئی شہرام کے گھر پہنچی تھی۔ اس سے پہلے وہ سینٹرل پارک اور فائی ریسٹورنٹ میں اسے تلاش کرچکی تھی' وہاں نہیں ملا تو اس کے گھر پر آئی تھی۔ یہاں بھی اسے مایوسی ہوئی تھی۔ لینڈ لیڈی نے بتایا تھا کہ وہ اپنے ملک البانیہ واپس جاچکا ہے۔

بیانکا شہر کی مقبول ترین ڈی جے تھی۔ بظاہر خوش باش نظر آنے والی بیانکا کی روح میں گہرے زخم تھے جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

شہرام اس کے ہوٹل میں آیا اور ایک اتفاقی حادثے میں زخمی ہوگیا' تو اس کے بازو کی ہڈی میں فریکچر آگیا۔

بیانکا شہرام سے پہلی نظر میں متاثر ہوجاتی ہے۔ وہ اسپتال میں اس کے لیے پھول رکھ کر جاتی ہے۔ شہرام جو محبت میں ناکام ہوکر بری طرح شکستہ ہے۔ اس مہربانی پر چونک جاتا ہے۔

بیانکا نے مختلف گانوں کے ردھم سے ایک میش اپ تیار کیا تھا۔ جوزف کا خیال تھا اس میں افسردگی کا رنگ غالب ہے۔ یہ رنگ بیانکا کا اصلی رنگ تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

بیانکا کے والد الیاس احمد پاکستان سے امریکا آئے تھے۔ انہوں نے یہاں محنت کرکے اپنا مقام بنایا پھر لبنان کی حیفہ سے شادی کرلی۔ اب دونوں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ بیانکا' ساری جائیداد اس کے نام پر تھی۔

الیاس احمد نے پاکستان سے اپنے بھائیوں کو بھی امریکا بلا لیا تھا۔ الیاس احمد کی اچانک وفات ہوجاتی ہے۔ ان کے گلے پر ایک سرخ لکیر ہوتی ہے۔

الیاس احمد کی وفات کے بعد ان کے بھائی حیفہ اور بیانکا کو بلا کر کہتے ہیں کہ وہ الیاس احمد کی ساری جائیداد ان کے نام منتقل کردیں۔ ان دونوں کے انکار پر وہ انہیں تہہ خانے میں بند کردیتے ہیں۔ بیانکا کا چچازاد احمد میڈیکل کا ریسٹورنٹ ہے۔

دوسری قسط



بیانکا کو شک ہے کہ وہ انہیں کھانے میں کچھ غلط دوائیں دے رہا ہے۔

شہرام سیرین کو ٹوٹ کر چاہتا تھا' وہ اس کی منگیتر تھی۔ منگنی کے بعد شہرام پڑھنے کے لیے امریکا چلا جاتا ہے۔ جب واپس آتا ہے تو سیرین بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ شادی' محبت ہر چیز سے منکر ہو جاتی ہے۔ شہرام کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی لڑکا ہے۔ وہ اس کا پتا لگا کر اسے مارنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

حیفہ اور بیانکا کو اس کے چچاؤں نے تہ خانے میں قید کر رکھا ہے۔

مکمل ناول



اس نے اپنی خوراک بستر مرگ پر پڑے ہوئے مریض سے بھی کم کردی تھی اور صبح شام نفرت کی اس کہانی کو بار بار اپنے ذہن میں دہرانے لگی تھی۔ کہانی کے اختتام تک وہ اس بات پر قائم بھی رہتی تھی کہ وہ کسی صورت کاغذات پر دستخط نہیں کرے گی۔ آج ان کی بچھائی بساط کے سارے مہروں نے بیانکا کی بساط کی ترتیب کو مات دے دی تھی۔

"کھانا کھالو بیانکا بیٹی۔۔۔"

اپنی کھانسی کو اسے مزید پریشان نہ کرنے کی غرض سے روکے ہوئے مام اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ بیانکا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور حیفہ مام جیسے سانس لینا بھول گئیں۔

وہ رو نہیں رہی تھی۔ آنکھوں میں اتنی طاقت ہی نہیں رہی تھی بس نمکین پانی کی تہہ تھی جو آنکھ کی شفاف پتلی پر چڑھ گئی تھی۔ نیم اندھیرے میں یہ آنکھیں کسی پہاڑی قلعے پر واقع لائٹ ہاؤس کی طرح چمکتی تھیں اور ان آنکھوں سے بیک وقت شیر کی سی بہادری اور گیدڑ کی سی بزدلی جھلک رہی تھی۔

"اٹھو بیانکا۔۔۔" آنسو ضبط کرتے ہوئے حیفہ مام نظریں چرا گئیں۔

بیانکا کو حیفہ مام کا چہرہ افسردہ کر گیا۔ دونوں بے بس تھیں۔ وہ دکھ سے حیفہ موم کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" اچانک بیانکا ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ حیفہ مام کی گردن کے نیچے دائیں طرف سرخ نشان کی ایک لمبی سی دھار تھی۔

"کیا۔۔۔؟"

"یہ۔۔۔" وہ حیفہ مام کو مزید روشنی میں لے گئی۔ یہ ہی نشان وہ ڈیڈ الیاس کی گردن پر بھی آخری وقت میں دیکھ چکی تھی۔ بیانکا نے خود کو تیزی سے پاتال کی طرف گرتے ہوئے محسوس کیا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے بھی یہاں جلن سی ہو رہی ہے۔ میرے خیال سے تکیے کی سائیڈوں کی ڈوری ہے جس نے گردن پر یہ نشان چھوڑ دیا ہے۔"

حیفہ مام نے وضاحت دی تھی۔ بیانکا نے تیزی سے آگے بڑھ کر تکیہ اٹھایا تھا۔ تکیے کے ارد گرد واقعی موٹی ڈوری بنی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا بیانکا۔۔۔؟ اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو۔ صرف جلن کا نشان ہی تو ہے۔ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ بڑی دیر تک تکیے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ساکت رہی تھی اور جب اس نے پلکیں اٹھائی تھیں تو اس کی پتھرائی آنکھیں اور چٹان چہرہ حیفہ مام کو نظر آیا تھا۔ ان کو رونا آگیا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔" وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کے تصور کی آنکھ بھٹکتے بہت دور نکل گئی تھی۔

ڈیڈ الیاس کا وجود اور اوپر کے پانچوں ابلیسوں میں سے کسی ایک کا تکیے سے ان کا منہ ڈھانپ دینا۔۔۔ کسی دوسرے کا ان کے بازو پکڑ لینا اور کسی تیسرے کا ان کی ٹانگیں۔۔۔ ڈیڈ الیاس ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں۔ بندھے ہوئے کسی جانور کی طرح جو ذبح ہونے کے لیے چھری دیکھ لیتا ہے' تڑپ رہے ہیں' لیکن ان کے چہرے سے تکیہ نہیں ہٹایا جا رہا۔ ان پر ترس نہیں کھایا جا رہا۔ وہ سانس ڈھونڈ رہے ہیں اور سانس کی ہلکی سے ہلکی ہوتی درز کسی اندھیرے غار میں بدلتی جا رہی ہے۔ بالآخر غار کے آگے پتھر آجاتا ہے۔۔۔ گھپ اندھیرا۔۔۔ انسان کا مقسوم۔۔۔

"بولو بیانکا۔۔۔ اللہ کے لیے کچھ تو بولو۔۔۔"

وہ چونکی' لیکن بول نہ سکی۔ اس کا تصور ٹوٹ گیا تھا' لیکن اس حقیقی تصور کی ہیبت ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس کی پتھرائی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اگر اسے حیفہ مام کے بھی ایسا ہی کرنے کا ڈر نہ ہوتا۔

"بیانکا دل کرے تو رو لیا کرو۔۔۔ لیکن خدا کے لیے اس طرح ساکت نہ ہو جایا کرو۔۔۔ یہ غار مجھے شاید نہ مار سکے' لیکن تمہاری ایسی صورت مجھے ضرور ختم کر دے گی۔"

بیانکا نہیں چاہتی تھی کہ تصور کی جس آنکھ سے اس نے ڈیڈ الیاس کو تکیے تلے چہرہ بے سانس اکھڑتے

اور لمحہ بہ لمحہ مرتے دیکھا ہے۔ حیفہ مام بھی اس کی زبان سے اس بھیانک تصور کو جالیں۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس مجھے ڈیڈ الیاس کی یاد آگئی تھی۔"

وہ حیفہ مام کی نظروں کی تاب سے پرے ہٹ گئی۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر اور آنکھوں کو تیزی سے ایسے بند کرتے ہوئے کہ جیسے ان میں مرچیں بھر دی گئی ہوں اس نے ڈیڈ الیاس کے قتل کے راز کو دبانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش نے اس کے چہرے کے سارے خدوخال کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

"کھانا کھالو۔۔۔" حیفہ مام کہتی جارہی تھیں۔۔۔ اور وہ دل ہی دل میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ جیسے ابھی ابھی اس نے ڈیڈ الیاس کی موت کی خبر سنی ہو۔

تب پہلی بار بیانکا کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ کسی مشکل میں گرفتار نہیں ہوئی ہیں، بلکہ اگر اس نے کوئی بھی فیصلہ کرنے میں دیر کردی تو وہ ایک ایسے خونی کھیل کا حصہ بن جائیں گی جس میں دونوں طرف سے ان کا ہی خسارہ ہوگا۔



"وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔"

مدہوش صبح کو کوئی پانی کے چھینٹے مار مار کر جگا رہا تھا۔ صاف آسمان پر قوس دھنک کے ساتوں رنگ بکھرے تھے۔ یہ قوس کسی کمان کی طرح اور اس میں سے نکلنے والی شعاع کسی تیر کی طرح دکھتی تھی اور یہ تیر کمان سفید بادلوں والے قنطور (آدھا انسان آدھا گھوڑا) کے ہاتھ میں تھی۔

"اس نے کل صبح مجھے بتایا۔"

شہرام نے آسمان پر ٹکٹکی باندھتے ہوئے کہا۔ طامیر کے گھر کے صحن میں پڑے بند پنجرے میں موجود روالی کبوتروں کی غرغوں اس آواز سے کہیں زیادہ تیز تھی۔

"تم اس کا کہا مان کیوں نہیں لیتے۔ تم واقعی اسے بھول کیوں نہیں جاتے۔ جو کچھ اس نے کیا قصوروار صرف وہ ہے۔ پھر تم کیوں خود کو اذیت دے رہے ہو۔" طامیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ شہرام کو کیسے سمجھائے۔

"وہ یہ کیسے بھول گئی کہ وہ میری منگیتر ہے۔۔۔ میری محبت۔۔۔ ایسی غفلت کا تو ایک لمحہ بھی گناہ ہوتا ہے اور دل بدل جانا لمحوں کی بات نہیں ہوتی۔ بہت دنوں تک انسان کے اندر کشمکش چلتی رہتی ہے۔ انسان جوڑ توڑ کرتا رہتا ہے۔"

شہرام کے تیور طوفان کی زد میں آئے درختوں کی طرح بگڑ رہے تھے اور طامیر کو ان بگڑتے ہوئے تیوروں سے بڑا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسے گھنٹوں سمجھا سکتا تھا اگر اسے ذرا سا بھی یقین ہوتا کہ اس کی باتوں کو سنا ہی جارہا ہے۔

"پورا ارجیر جانتا ہے کہ ہم دونوں کی منگنی ہو چکی ہے۔ ایسے میں اس کے قریب آنے کی جسارت کون کرسکتا ہے؟"

سورج کی شعاعیں تیکھی ہوگئی تھیں۔ اور تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ معصوم قنطور سوچ سمجھ کر لگائے جانے والے ہدف کو بھیگی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"تم۔۔۔ تم اس لڑکے کو جانتے ہو طامیر۔۔۔؟ کسی پر شک ہے تمہیں؟"

شہرام کہتے ہوئے پلٹا تھا اور طامیر اپنی نظروں کے زاویے کسی ایک جگہ مرتسم نہ کرسکا تھا۔

"نہیں۔۔۔" بڑی مدھم آواز سے اس نے کہا۔ "تم نے سیرین سے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔"

"اس نے نہیں بتایا۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے تم اتنی شدت سے جاننا چاہتے ہو۔ اس جان کاری میں تکلیف کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

"نہیں میں جاننا چاہتا ہوں۔" شہرام چلایا تھا۔ "اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑنا چاہتا ہوں۔۔۔ درحقیقت۔۔۔ درحقیقت میں اس لڑکے کو جان سے مار دینا چاہتا ہوں۔۔۔ جس نے سیرین کو بہکایا۔"

"تم اس لڑکے کو کیوں جان سے مار دینا چاہتے

ہو۔ اگر وہ قصوروار ہے تو سیرین بھی بے قصور تو نہیں۔"

زمین پر نظریں گاڑے گاڑے وہ اپنے عزائم میں جیسے ردوبدل کرنے لگا۔

"ہاں۔ ٹھیک کہا۔۔۔ سیرین بے قصور تو نہیں۔۔۔ ٹھیک ہے میں دونوں کو ماردوں گا۔۔۔ ختم کردوں گا۔۔۔ کم از کم اس طرح دنیا سے ایک بے وفا تو کم ہو گا۔۔۔ محبت کی بے قدری کرنے والا۔"

"اتنی شدت سے مت سوچو شہرام۔۔۔ ایسا رویہ تم پر نہیں جچتا۔"

"کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

"تم غصے میں ہو شہرام۔۔۔ بہتر ہے کہ تم امریکا واپس چلے جاؤ۔ یہاں تم پاگل ہو جاؤ گے بلکہ کسی حد تک ہو چکے ہو۔"

"مجھے اپنی یہ صورت حال قبول ہے۔۔۔ میں ٹھیک ہونا نہیں چاہتا۔"

طامیر نے دکھ بھری نظروں سے اپنے دوست کو دیکھا تھا۔

"اس لڑکے کو ڈھونڈو گے کیسے۔۔۔؟" بڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

"جب وہ سیرین سے ملنے آئے گا تب۔۔۔"

شہرام سب کچھ پلان کرکے بیٹھا تھا۔ اس بات نے طامیر کو مزید دکھی کر دیا۔



روشنی کی ایک لمبی تکونی لکیر تھی جو سنگ برج سیناں کی تختی کے اوپر بچھ کر ساکن تھی۔ بابا زلاری اسی روشنی کی لکیر کو دیکھ کر ٹھٹک کر رو کے تھے۔ شاید ملازم آج اندر ریسٹورنٹ کی لائٹس کو بند کرنا بھول گئے تھے، لیکن پھر شٹر کو دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گئے تھے۔

شٹر کے دونوں طرف کے تالے غائب تھے۔ زنشوسیہ کے ہوتے ہوئے کوئی ملازم اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتا ہے ارحیر ایک پرامن علاقہ تھا چوری چکاری کا زیادہ ڈر نہیں تھا، لیکن احتیاط میں تو کسی بھی صورت کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

دوپہر کو ریسٹورنٹ کے تالے کھولتے وقت تالوں کو شٹر کے آہنی کنڈوں میں اٹکا دیا جاتا تھا۔ رات گئے جب ریسٹورنٹ بند ہوتا تو شٹر کے ساتھ تالے بھی واپس نیچے آجاتے تھے۔ اس طرح تالا لگانے میں چوک چاہ کر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

تو کیا اندر چور تھے؟

دیوار کے ساتھ جڑ کر انہوں نے شٹر کے ساتھ کان لگا دیے۔

کچھ مبہم سی آوازیں تھیں۔ اندر ہی کہیں سے آتی ہوئی پر جو بھی گفتگو ہو رہی تھی بہت غصے اور تیزی سے ہو رہی تھی۔ بڑی دیر تک وہ گفتگو کی نوعیت کو سمجھ نہ پائے۔ پھر انہوں نے ایک آواز کو پہچان لیا تھا۔

وہ شہرام کی آواز تھی۔ تب گفتگو کی نوعیت بھی ان کی سمجھ میں آنے لگی۔

ہلکے سے شٹر کے کنڈے پر ہاتھ ڈال کر انہوں نے اسے اوپر اٹھا ڈالا۔

اسٹور روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شہرام اور طامیر کی آوازیں وہاں سے ہی آرہی تھیں۔ اندر جانے سے پہلے وہ سب کچھ جان لینا چاہتے تھے۔

طامیر کرسی پر جھکا بیٹھا تھا اور شہرام زمین پر پڑی "سان" پر کوئی پرانا خنجر تیز کرنے میں مصروف تھا۔

"تو تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو؟" ایک آہنگ نرمی سے بابا زلاری نے پوچھا۔ دونوں نے چونک کر بابا زلاری کو دیکھا۔ شہرام کے کام کرتے ہاتھ رک گئے تھے اور اس کی جھکی آنکھیں اٹھ کر دوبارہ مزید نیچے تک جھک گئی تھیں۔

"بولو۔۔۔ تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو۔۔۔ تم قاتل بننے جا رہے ہو۔"

شہرام کچھ نہیں بولا تھا اور طامیر اپنے اندر نظریں چار کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔

"جو لفظ تمہیں اتنی شرم دلا رہا ہے۔ اتنا ہیبت ناک ہے کہ تم اس کی تصدیق بھی نہیں کر پا رہے۔۔۔ وہ عمل

تم کیونکر کر گزرو گے؟"

"ہاں' انہوں نے مجھے دکھ دیا ہے۔۔۔ میری زندگی کا سب سے بڑا غم دیا ہے۔۔۔ مجھے اس جنون میں مبتلا کرنے والے وہ دونوں ہیں۔۔۔ میں اکیلا اس آگ میں جلنا نہیں چاہتا۔۔۔ مجھے راکھ کے ڈھیر میں دھنسا کر وہ دونوں خوش نہیں رہ سکتے۔۔۔ میں ان سے ان کی ہر خوشی چھین لوں گا۔۔۔ میں دونوں کو ختم کردوں گا۔"

شہرام نے تیزی سے کہا تھا' لیکن اس کے ہاتھ گزشتہ کام پورا کرنے کے لیے حرکت نہ کرسکے تھے۔

بابا زلاری اور طامیر نے بے ارادہ ایک دوجے کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں دکھ کی وہ کیفیت محسوس کررہے تھے جو کسی اپنے کی اذیت پر آنکھوں میں نجانے کہاں سے اتر آتی ہے۔

"تم ہو نہار تھے۔۔۔ مجھے دکھ ہوا کہ تم بھی فریبی جذبوں کے پجاری نکلے۔۔۔ کیا اس طرح تمہارے دل کو قرار آجائے گا؟"

"پتا نہیں۔۔۔ لیکن اس بے قراری سے بہت بہتر کہ میں آنے والے وقت کے قرار کو حاصل کرنے کے لیے اپنی سوچ پر عمل درآمد کرگزروں۔"

"حالانکہ وہ قرار سراسر شک پر مبنی ہے۔"

"آپ میں اور ہم میں یہ ہی تو فرق ہے بابا۔۔۔ آپ کی تعلیم اس قدر مستند ہے کہ ہماری اسناد اس کے آگے خود بخود ہی رد ہوجاتی ہیں۔ بہتر ہے آپ مجھے جاہل ہی رہنے دیں۔" شہرام تلخی سے بولا تھا۔

"اور اگر پھر بھی تم مطمئن نہ ہوئے تو؟"

"تو میں۔۔۔ میں خود کو ختم کرلوں گا۔"

"تمہاری چھٹیاں کل ختم ہوجائیں گی۔۔۔ تم امریکا واپس چلے جاؤ۔۔۔ وہاں جاکر سکون سے سوچو۔۔۔ یقیناً وقت گزرنے کے ساتھ تم اپنی آج کی سوچ پر پچھتاؤ گے۔۔۔ تمہاری ماں کی حالت بھی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔۔۔ اس نے اب "سلی" کہنے پر چڑنا بھی بند کردیا ہے۔۔۔ وہ تمہارا دکھ نہیں دیکھ سکتی اور میں غم زدہ حالت میں اس کو۔۔۔ اس کے کباب بھی اب جلنے لگے ہیں۔ اس کا بیس سال کا تجربہ رائیگاں ہورہا ہے۔ ان میں اب کوئی خوشبو نہیں آتی۔۔۔ آنسوؤں کی نمی کا گمان غالب رہتا ہے۔۔۔ کسٹمرز شکایت کرتے ہیں تو وہ آگے سے رونے لگتی ہے۔۔۔ اس کے بس میں تمہارے لیے کرنے کو کچھ ہوتا تو وہ ضرور کرگزرتی۔۔۔ وہ سیرین کو غلام کی حیثیت سے خرید لیتی۔۔۔ چاہے۔۔۔ چاہے بدلے میں ساری زندگی خود اس کی غلام بن جاتی' لیکن افسوس یہ دل کے رجحان کسی کے کہنے سے نہیں بدلتے۔۔۔ ان پر ازل سے اللہ ہی غالب رہا ہے۔ اس لیے ہمارے اور تمہارے لیے یہ ہی بہتر ہوگا کہ تم کل واپس چلے جاؤ۔۔۔ جو بے وفا ہے اس کے لیے اپنی زندگی اپنا کیریئر داؤ پر مت لگاؤ۔"

ان سب باتوں کا شہرام پر الٹا ہی اثر ہوا تھا۔

"آپ کے لیے یہ سب کہنا آسان ہے بابا۔۔۔ کیونکہ آپ کی زندگی میں اماں زیتو یہ جیسی خاتون رہی ہیں' جنہوں نے ہمیشہ ہر مشکل کو آپ تک پہنچنے سے پہلے خود پر سہا ہے۔۔۔ آپ پر ہر مشکل۔۔۔ ہر غم چھن کر پہنچا ہے بابا۔ اس لیے آپ میرے غم کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔۔۔ میرا دل درد سے پھٹا جارہا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔۔۔ کیا آپ ایک بیٹے کا پاگل ہوجانا برداشت کرپائیں گے۔۔۔ بولیے۔۔۔ بولیے بابا۔"

"تم پاگل نہیں ہوگے۔۔۔ محبت میں سیاہ چوغہ پہن لینا آسان نہیں ہوتا۔ یہ پہن بھی لو تو نبھانا مشکل ہوجاتا ہے۔"

"آپ کہتے تھے ناکہ عورت سلی ہے۔ چھوٹے وار کرنے والی اور مرد سان ہوتا ہے پھر مجھے مرد بننے دیں بابا۔۔۔ مجھے بڑا وار کرنے دیں۔" شہرام کی آنکھوں میں نمی بھر گئی تھی۔

اب بابا زلاری کچھ نہیں بولے تھے۔ شہرام کی آنکھوں کی نمی دیکھ کر ان کی اپنی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ طامیر بھی زمین پر بچھی جاجم کے جال کو کھوجنے لگا تھا۔

پھر بابا زلاری بھی شہرام کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئے اور خنجر کو انہوں نے شہرام کے ہاتھ سے لے لیا۔

"کیا تم اتنے بہادر ہو؟" خنجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔ "بدلہ تمہاری سرشت میں شامل نہیں ہے شہرام... تمہیں تو گلہریوں جن سے تم اتنی نفرت کرتے ہو ان پر بھی ترس آجاتا ہے۔"

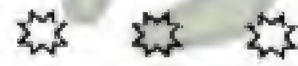
"اب میں وہ بزدل شہرام نہیں رہا۔" وہ دو ٹوک گویا ہوا۔ بابا زلاری کی مداخلت اسے اب بری لگنے لگی تھی۔

"بے خوفی بعض اوقات بے ضمیر بھی کر دیتی ہے... یہ بڑی تشویش ناک حالت ہوتی ہے۔ پھر اب تو میں بھی تمہاری اس بے خوفی کو دیکھنا چاہوں گا۔ تمہاری ہمت اور جرات کو پرکھنا چاہوں گا۔"

خنجر کو ٹیڑھا کر کے بابا زلاری نے اس کی دونوں طرف کی دھار کو باری باری انگلی کی پور سے چھو کر جانچا تھا اور پھر شہرام کو واپس پکڑایا تھا۔

"اس طرف سے دھار کو تھوڑا اور تیز کرو شہرام... کسی اپنے پیارے کے سینے میں خنجر اتارنے کے لیے ہمارا جنون صرف چند لمحوں کا ہی ہوتا ہے... اگر تم نے اس طرح عجلت میں کام کیا تو وہ بھی تڑپتے رہیں گے اور تم بھی... بہتر ہے کہ کوئی ایک تو تسلی حاصل کرے۔"

بابا زلاری نے بڑے پتے کی بات بتائی تھی اور سان پر خنجر کی رگڑ کی آواز دوبارہ پھیلنے لگی تھی۔



تہہ خانے کی دیواریں کچھ مزید تنگ ہو گئی تھیں۔ اور چھت اور فرش نے آپس میں مل جانے کی ٹھان لی تھی۔ ایسے میں حیفہ مام کی آواز اس کھنکھناتے سکے کی مانند تھی جو کسی دھاتی ڈبے میں اندر ہی اندر کہیں بجتا چلا جا رہا ہو۔

"مجھ سے وعدہ کرو بیانکا... تم ایسا ہرگز نہیں کرو گی۔"

حیفہ مام نے اپنی کھانسی ضبط کر کے رکاوٹ اور لرزتی آواز میں کہا تھا۔ یہ جملہ بولنے کے لیے انہیں اپنی بہت سی قوتوں کو یکجا کرنا پڑا تھا۔ جیسے اس ننھے سے تہہ خانے میں ایک جگہ بیٹھے رہنے کے باوجود بھی ان کے پیروں پر چھالے پڑ کر درد کرنے لگے ہوں۔

"چاہے کچھ بھی ہو جائے... میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے... تم ان لوگوں کو ایک پینی بھی نہیں دو گی۔"

رک کر حیفہ مام نے اپنا سانس درست کیا۔ دوبارہ بولنے میں انہیں کئی زمانے بیت گئے۔

"یہ سب الیاس نے صرف محنت سے نہیں بنایا... ان ساری چیزوں میں اس کے ہاتھوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ میں ان چیزوں کو کبھی ان کے ناپاک ہاتھوں میں جاتے ہوئے برداشت نہیں کر پاؤں گی۔" اب حیفہ مام باقاعدہ بے قاعدہ طریقے سے رونے لگی تھیں۔

"وعدہ کرو بیانکا تم ایسا کچھ بھی ہرگز نہیں کرو گی... ایسی سوچ کو بھی گناہ سمجھو گی۔ یہ لوگ شیطانی حربے آزما رہے ہیں ان کو آزمانے دو... یہ مزید کیا کریں گے... کیا تمہیں اور مجھے قتل کر دیں گے... کسی کو قتل کرنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے اور یہ لوگ اتنے ہی بزدل ہیں۔"

وہ خاموشی سے اور بھیگی آنکھوں سے حیفہ مام کی باتیں سنتی رہی۔ اس نے حیفہ مام کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ یہ لوگ کس حد تک نڈر اور جرات مند ہیں اور یہ کہ ان کی بہادری گناہ کے درجوں پر فائز ہو چکی ہے۔

سردی دن بدن بڑھنے لگی تھی۔ موسم میں ایک دم سے ہی شدت آتی جا رہی تھی۔ پہاڑی علاقوں پر برف باری کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس صبح جب پہلے زینے پر کھانا رکھا گیا تو بیانکا نے تقریباً چیخ کر اور التجا آمیز لہجے میں مزید کمبلوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اسے خود کی تو کوئی پروا نہیں تھی لیکن حیفہ مام روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں اور چھال اترے سفیدے کی طرح سفید... ایک ایک لحاف ان دونوں کے لیے ناکافی تھا۔ وہ دونوں لحاف اکٹھے بھی جوڑ کر

سوتی تب بھی سردی 'کپکپاہٹ رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ان کی جھریوں زدہ نحیف آنکھوں میں کاجل کی کالی دھار سلوٹوں میں بٹ گئی تھی۔

پندرہ دنوں کے گزرتے وقت نے ہر آس کو ختم کردیا تھا۔

دوپہر کے وقت جب پھر کھانا رکھا گیا تو بیانکا نے دوبارہ کمبلوں کا مطالبہ کیا۔

اور رات کے کھانے پر اسے جواب مل گیا۔

کسی طرح کی امید رکھنا عبث تھی... ہاں ٹھیک کہا تھا ان لوگوں نے کہ وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام نہیں کررہیں۔ وہ ان دونوں کو جب چاہے ختم کرسکتے ہیں۔"

پھر ساری رات حیفہ مام کی بندش زدہ کھانسی سنتے رہنے کے بعد اس نے دل کڑا کرکے رات ہی رات میں ایک فیصلہ کرلیا تھا۔

"مام کو میڈیسن کی ضرورت ہے۔" اس نے دروازے کی چکنی ہٹی ہوئی درز سے منہ لگا کر کہا تھا۔ تختی دوبارہ لگانے والے ہاتھ تھوڑی دیر کو رکے تھے۔

"ان کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔"

اپنی بات پر توجہ دیے جانے پر وہ مزید جوش سے چلائی۔ اب کے رکے ہوئے ہاتھ تختی کو دوبارہ چوکھٹے میں لگانے لگے تھے۔

"میں ایک بڑی رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔"

اس نے آخری ہتھیار چلایا۔ رات ہی اس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک بڑی رقم ان سب کے منہ پر دے مارے گی اور وہ کتوں کی طرح اس کی پھینکی ہڈی پر قناعت کرلیں گے۔ دروازہ کھول کر اسے باہر بلایا گیا تھا۔

بڑے دنوں بعد... جیسے ایک عرصے کے بعد وہ تازہ کھلی فضا میں آئی تھی۔

حیفہ مام تہہ خانے میں بند نہ ہوتیں تو وہ کسی بھی طرح یہاں سے بھاگ جانے میں کامیاب ہوجاتی چاہے اسے ان پانچوں کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔

"تم اتنی بے وقوف نہیں ہو جتنی تمہاری ماں... تم یقیناً" سمجھتی ہو کہ بھائی زندہ ہوں تو مرے ہوئے بھائی کی دولت پر ان بھائیوں کا حق زیادہ ہوتا ہے۔" تایا غفار نے کہا تھا۔

"مام کی طبیعت خراب ہے... انہیں ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہے۔" وہ ان پانچوں کے ہجوم میں گھری صوفے پر بیٹھی لاحاصل مطالبہ کررہی تھی۔

"یہ اب تم پر منحصر ہے کہ تم ساری صورت حال کو کس رخ پر موڑتی ہو۔" تایا غفار نے کاغذات نکال کر ایک بار پھر اس کے آگے رکھے تھے۔

"میں ایک بڑی رقم دے سکتی ہوں' لیکن میں ان کاغذات پر سائن نہیں کروں گی۔"

"بے وقوفی کروگی..."

"ایک جوتی ماریے اس کے منہ پر' کیسے نہیں مانے گی یہ..." چاچی فیروزہ نے کہا تھا۔

"اپنی ماں پر گئی ہے... ڈھیٹ' کمینی' مکار' حرافہ..." تائی شہناز بھی بولی تھیں۔ انہیں حیفہ سے سالوں کی خار تھی۔

"ڈھیٹ' کمینی' مکار' حرافہ..." اسے یہ چاروں وصف خود میں اور اپنی مام میں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتے تھے۔

"ہم تم پر کوئی ظلم نہیں کررہے..."

وہی پرانی بات... پتھرائی آنکھوں والے اندھے لوگ...

بیانکا غم سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہارے پاس حیفہ کا اپارٹمنٹ اور بینک بیلنس..."

"بس کیجئے بھائی صاحب... بہت سمجھالیا اس حرافہ کو۔"

چچا جلال نے تایا غفار سے کہا تھا۔ پھر انہوں نے بیانکا کے بال پکڑ کر اسے جیسے نیند سے جگایا تھا۔ اس اچانک حملے کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ ایک کراہ اس کے حلق سے نکلی۔

"حرام زادی کرو دستخط۔" وہ تکبر سے چلائے تھے۔

"حرام زادی..." وہ اس لفظ کا مطلب نہیں جانتی

تھی ورنہ اسی وقت مر جانے کو ترجیح دیتی۔

"نہیں کروں گی۔" وہ اپنے بال چھڑانے کے لیے مزاحمت کرنے لگی۔

"تیل چھڑک کر آگ لگا دو اس کو اور اس کی ماں کو بھی۔" شہناز نے کہا۔

"آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ یہاں سائن کرو گی یا واپس نیچے جاؤ گی۔"

احمد آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگا تھا۔ قدرت کے نظام میں اس کے انجام کو دیکھ کر ایک استہزائیہ مسکراہٹ بیانکا کے لبوں پر آگئی تھی۔ احمد نے اپنی دانست میں اس مسکراہٹ کو انکار سمجھا تھا۔ بالکل صحیح سمجھا تھا۔

"پھر مرو اپنی ماں کے ساتھ۔"

ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس نے بیانکا کے بال پکڑے تھے۔ پھر گھسیٹتا ہوا واپس تہہ خانے پر لایا تھا اور سیڑھی سے نیچے لڑھکا دیا تھا۔ ایک بار پھر تعفن زدہ تہہ خانے کی فضا نے اس کا دم گھونٹ دیا تھا۔

فٹ بال کی طرح سیڑھیوں سے لڑھک کر گرتے ہوئے وہ نیچے جا کر ساکت ہو گئی تھی۔ مام نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا تھا۔ پھر دونوں ایک دوجے کے گلے لگ کر رونے لگی تھیں۔

"تم نے ایسا کیوں کیا بیانکا۔ جو لوگ خود ہاتھوں میں کاسہ لیے ہوئے ہوں وہ کسی دوسرے کی التجا کب سنیں گے۔ تمہیں میرے علاج کی بھیک نہیں مانگنی چاہیے تھی۔ ابھی میں اتنی بھی کمزور نہیں ہوئی۔"

بڑی دیر تک روتے رہنے کے بعد حیفہ مام نے اس سے کہا تھا۔ ہمت نہیں ہارنا میری بچی۔ گھبرانا نہیں ہے۔ ورنہ تمہارے ڈیڈ الیاس کی روح برا مان جائے گی۔"

"مجھے اپنے سے زیادہ آپ کی فکر ہے مام۔" وہ مزید رونے لگی۔

"میری فکر نہ کرو میری بچی۔ میں ٹھیک ہوں۔ لیکن تم ایسا کرنے کا دوبارہ نہ سوچنا۔ میں مر کر بھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

حیفہ مام کے ان الفاظ نے بیانکا کے اندر ایک نئی ہمت اور طاقت پیدا کی تھی۔ آنسو خشک کر کے وہ ایک نئے عزم سے سوچنے لگی تھی۔

اگلے دن صبح اس کے سارے عزائم رخصت ہو گئے تھے۔

ساری رات بیانکا جاگتی رہی تھی اور حیفہ مام بھی۔ کھانسی کو ضبط کرتے کرتے جب وہ نڈھال ہو جاتی تھیں تو اپنا منہ لحاف کے اندر تک لے جاتی تھیں۔

پھر جب صبح کی پہلی کرنیں تہہ خانے کے اندر اترنے لگیں تو ایک منظر نے بیانکا کا سارا وجود تاریک کر دیا تھا۔

حیفہ مام کا لحاف خون آلود تھا۔

وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف بھاگی تھی۔ اور دونوں ہاتھوں سے دروازہ بجاتے ہوئے وہ پوری جان لگا کر چلائی تھی۔

"میں سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اسے زیادہ دیر تک چلانا نہیں پڑا تھا۔ دروازہ تھوڑی دیر بعد ہی کھل گیا تھا۔

وہ رات حاملہ تھی۔ ان گنت اندھیروں سے۔

اماں زیتوبیہ نے اسے منع کیا تھا کہ وہ آج کی رات گھر سے باہر نہ نکلے۔ وہ ہر روز صرف آج کی رات پر خاص تاکید کیا کرتی تھیں۔ شہرام جانتا تھا کہ یہ آج کی رات کل بھی آئے گی۔ وہ بہانے بہانے کی گئی ان تاکیدوں کو بھلا اب کہاں سننے والا تھا۔

اس کی چھٹیاں ختم ہوئے کافی دن گزر چکے تھے۔ لیکن وہ واپسی کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ گزشتہ کافی دنوں سے اس کی سرگرمیاں بھی بڑی حد تک پر اسرار ہو گئی تھیں یا کم از کم اماں زیتوبیہ کو ایسا ہی لگا تھا۔ اس کے ہر دفعہ رات گئے گھر واپس آنے پر بابا زلاری کی نظروں سے ایک ہی سوال عیاں ہوتا تھا۔

"تو ہو گئی تسلی؟"

اور شہرام کی آنکھوں میں دہکتے خونی گلابوں کو دیکھتے

ہوئے انہیں جیسے خود ہی جواب مل جاتا تھا۔
"نہیں ... ابھی نہیں ... ورنہ ان روشن آنکھوں سے جھلکتی بدلے کی آگ بجھ چکی ہوتی۔"
ان دس دنوں میں وہ رات دن سیرین کے گھر کے باہر پہرہ دیتا رہا تھا۔
دروازے کے بند کواڑ آج بھی اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ ان دس دنوں میں نہ تو کوئی وہاں اپنے نقب کی یاد تازہ کرنے آیا تھا اور نہ ہی سیرین کسی سے ملنے کہیں باہر گئی تھیں۔ شہرام کو اب بے زاری ہونے لگی تھی۔ لیکن اسے اپنے دل کی بے چینی کو ختم کرنے کے لیے مستقل مزاجی سے کام لینا تھا۔
ہوا کی خنکی اس کے بھاری کوٹ کی نہ جانے کس درز سے اندر آکر اسے سن کر رہی تھی۔ اس کے اس کوٹ کی اندرونی جیب کے اندر صیقل کیا ہوا خنجر بھی موجود تھا جس کی ٹھنڈی سطح پر شہرام کے ہاتھ بار بار ٹکراتے تھے۔
اس کے شکوک و شبہات بھی کچھ کچھ اس خنجر کی طرح ہی ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ شاید سیرین کی زندگی میں کوئی نہ ہو اور اس نے اپنی ہی کسی ذہنی سوچ کے تحت شہرام کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔
شہرام نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا... چاند اور اس کا سر اوس سے تر تھا چودھویں کا چاند صنوبر کے درختوں کی کالی بھیانک شاخوں سے جھلکتا پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اوس اور خنکی کے باعث اس پر غنودگی اور تھکن طاری ہونے لگی تھی۔ وہ اس کھیل سے تنگ آنے لگا تھا۔
طامیر نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے رات کے اندھیرے میں سیرین سے ملنے آتا ہے۔ اور وہ سام (زہر دینے والا) ان دس دنوں میں ایک بار بھی نہیں آیا تھا۔
شہرام آج رات بھی ناکام و نامراد ہو کر واپس گھر جانے کے ارادے باندھنے لگا تھا۔ تب ہی دو عمل ایک ساتھ ہوئے تھے۔
چاند گرہن کے شکم میں داخل ہونے لگا تھا۔
اور دلکی چال سے آتے سرسراتے قدموں کی چاپ شہرام کے کانوں میں پڑنے لگی تھی۔
خشک گھاس اور اکڑے پتوں سے ڈھکی پگڈنڈی پر کوئی بڑے سبج سبج کر قدم رکھ رہا تھا۔ اور مردہ پتے ایک چور کی آمد کا اعلان چیخ چیخ کر کر رہے تھے۔ شاید وہ سوکھے پتے مر کر بھی ارجیر کی پرامن سرزمین سے باوفا تھے۔ اور اس نقب زنی کی واردات کے کسی صورت طرف دار نہیں بن پا رہے تھے۔
شہرام کو ایک ایک پیڑ چلاتے ہوئے محسوس ہوا۔ درختوں، شاخوں، پتھروں، پانی کے قطروں پر کسی نے جیسے اسے اشارہ دیا۔" وہ آ رہا ہے... وہ، تمہارا مجرم..."
پھر رفتہ رفتہ قدموں کی سرسراہٹ قریب آنے لگی۔ اندھیرے سے نترا ایک انسانی ہیولا اسے دکھائی دیا۔
گرہن رفتہ رفتہ بڑھنے لگا تھا وہ انسانی ہیولا شہرام کی نظروں کے مدمقابل سیرین کے گھر کے دروازے کے سامنے تک گیا۔ شہرام نے اپنے جسم کا بال بال کھڑا ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔
شجر صفت گہرے سائے نے بند چوبی دروازے پر دستک دی تھی۔ ایک، دو... تین بار... خاص انداز سے...
کوٹ کے اندر موجود خنجر پر شہرام کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ لیکن اس کا دل کسی صورت مضبوط نہیں ہو تا تھا۔
گرہن مکمل ہو گیا اور سیرین کے گھر کا دروازہ کھل گیا۔
دو انسانی جسم جن میں ایک مرد تھا اور دوسری عورت، چند لمحے ایک دوجے کو دیکھتے رہنے کے بعد کل دار گڈوں کی طرح ایک دوجے سے دیوانہ وار لپٹے تھے۔
شہرام کو اپنا سانس درست کرنے میں جیسے ایک صدی بیت گئی تھی۔ سیرین اکیلی نہیں رہی تھی اس کی زندگی میں واقعی کوئی اور آ چکا تھا۔ اس بات پر ایمان

لے آنے کے بعد یک لخت شہرام کے دل کی دھڑکنیں ادھر اُدھر کر بکھر گئیں۔

اس کی محبت پانی پر لکھی تحریر تھی اس سوچ نے اسے زخمی کر دیا۔

دروازے کے پار صحن کے اندر ایک قندیل جل رہی تھی جس کی مدھم گلابی روشنی پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیرین پیچھے ہوتے ہوئے اس قندیل کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔

اور شہرام آگے ہوتے ہوئے ایک بڑے پتھر پر چڑھ گیا۔ نقب زن نے اپنے سیاہ کوٹ کا کالر گردن سے اوپر اٹھا رکھا تھا وہ اس کی شکل نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

دونوں قندیل کے نیچے کھڑے تھے۔ وہ دونوں کیا کر رہے تھے اس میں دو رائے قائم کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ مدھم گلابی روشنی یہ منظر بڑی وضاحت سے دکھا رہی تھی۔

دونوں جو آپس میں گم تھے... رکے... چند القابات کہے گئے اور پھر ایسے گم ہو گئے جیسے ناگ اور ناگن بہار میں ہوتے ہیں۔ ایک ہوک شہرام نے اپنے دل میں اٹھتی محسوس کی۔

چودھویں کا روشن چاند رفتہ رفتہ گرہن کے ظرف سے باہر جھلکنے لگا تھا۔ قندیل کی روشنی اور خنجر کی سطح سرد تر ہو چکی تھی۔

پھر اونچے کالر کے کوٹ والا تاریک انسانی ہیولا گھوما تھا۔ اب سیرین کی پشت شہرام کی طرف تھی اور اس آدمی کا چہرہ شہرام کے روبرو... لیکن دور... بڑے توقف اور دل کی تسکین کے بعد کالر والا سر اوپر کو اٹھا تھا... اور دودھیا روشنی نے اس چہرے کو منعکس کیا تھا۔

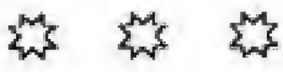
اور پھر دو عمل ایک ساتھ ہوئے تھے۔

درد کا ایک گولا تھا جو شہرام کے اندر پھٹا تھا اور اس کے پیروں کے نیچے موجود پتھر سرک گیا تھا شہرام پھسل کر منہ کے بل گرا تھا۔

وہ نقب زن... سام... اس کا مجرم... اس کے حق پر ڈاکا ڈالنے والا... وہ کوئی اور نہیں تھا وہ حسنی تھا...

ولائی حسنی زلادی... شہرام کا سگا بھائی۔

شہرام کے دل نے کسی بارودی سرنگ کی طرح پھٹنا شروع کر دیا' چاند ایک بار پھر گہنانے لگا ہمیشہ کے لیے اور اس رات میں اسقاط ہوا... ان گنت روشنیوں کا۔



حیفہ مام کو تہہ خانے سے باہر نکال لیا گیا تھا۔

بیانکا نے دستخط کر دیے تھے۔ جہاں جہاں ان کو درکار تھے۔ فی الحال اس کے ذہن میں حیفہ مام کی سلامتی سے زیادہ بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں تھی... دستخط لینے کے بعد وہ لوگ کسی بھی طرح کے علاج سے مکر بھی سکتے تھے ان سے یہ امید زیادہ عبث نہیں تھی' لیکن بیانکا کو اب یہ جوا کھیلنا تھا... پوری طرح سے... اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر... اور اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا... حیفہ مام کی کی گئی تاکید اور نصیحت کی پروا کیے بغیر... ان کی التجا کو نظر انداز کر کے۔

تہہ خانے سے باہر نکلنے کے بعد حیفہ مام کہاں تھیں۔ یہ بیانکا نہیں جانتی تھی۔ ان کا علاج ہو رہا تھا۔ اس بات کا بھی اسے صرف اندازہ ہی تھا۔ وہ بدستور اسی تہہ خانے میں بند تھی۔ جائیداد منتقلی کے سارے عمل تک اسے یہاں ہی رہنا تھا۔

اس کے بے حد اصرار پر ان سات دنوں میں صرف دو بار سیل فون پر اس کی بات حیفہ مام سے کروائی گئی تھی۔ کمزوری حیفہ مام کی آواز سے جھلکتی تھی' تاہم انہوں نے بیانکا کو تسلی دی تھی کہ ان کا علاج ہو رہا ہے۔ کہاں ہو رہا ہے' یہ بات وہ نہ بتا سکی تھی۔ بیانکا کو حیرت تھی کہ حیفہ مام جہاں بھی ہیں' آخر خود کسی طرح سے باہر نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہیں۔

اس کی سوچ کمزور تھی۔

جو لوگ انہیں قید کرنے کے لیے دنوں یا شاید مہینوں منصوبے بناتے رہے تھے' وہ کیا حیفہ مام کو کسی بڑے ہسپتال لے گئے ہوں گے؟ تاکہ ان کی ساری محنت' ساری چال بازی پر پانی پھر جائے۔ پھر ایک خیال

اچانک سے بیانکا کے دماغ میں آیا۔
"احمد میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے۔"
تو کیا مام کا علاج اوپر کے ہی کسی کمرے میں ہو رہا ہے۔ ایک ناتجربہ کار اور شیطان صفت انسان کے ہاتھوں۔۔۔؟

یہ سوچ کر ہی بیانکا کا سر گھومنے لگا۔
لیکن اس چیز نے اسے اطمینان دلائے رکھا کہ کالے اور سرخ سرکل میں ایک خانہ ہرے رنگ کا بھی ہوتا ہے۔ جو زیادہ تر جواریوں کی نظروں سے چھپا ہی رہتا ہے۔
ابھی صرف کاغذات پر دستخط ہوئے تھے بہت سے آسان مراحل کے ساتھ ساتھ یونین کے آفس میں بذات خود بیانکا کی ظاہری حاضری کا مشکل ترین مرحلہ ابھی آنے والا تھا۔
بیانکا اس ایک دن کے لیے دن رات ایک کرنے والی تھی۔۔۔ یہ لوگ شاطر تھے بلاشک و شبہ۔۔۔ لیکن دریا کی گہرائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔ بیانکا اس حد سے آگے جا کر سوچنے لگی تھی۔
ان لوگوں نے وہاں کے کتنے لوگوں کو خرید لیا ہو گا۔۔۔ دولت نے اپنی کس حد تک طاقت دکھائی ہو گی۔۔۔ پانچ لوگ۔۔۔ دس لوگ۔۔۔ پورا عملہ۔۔۔ یونین کا پورا آفس۔۔۔ لیکن سڑکوں، دوکانوں پر پھرنے والے ہزاروں لوگوں کو تو یہ نہیں خرید سکتے ناں۔۔۔ تو پھر یہ مجھے مدد کے لیے پکارنے سے کیسے روک پائیں گے۔
بیانکا نے اپنی ہی ہنسی دبائی تھی۔
اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس گھر سے باہر نکلنے کے بعد جیسے ہی خود کو رش میں محسوس کرے گی چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کرے گی۔ تب ان لوگوں کے پاس موت کے علاوہ بچنے کا اور کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا۔
یہ لوگ مجھے مام کی جان کی حفاظت کی دھمکی دے کر وہاں لے جائیں گے۔ میں ان کو ان کی ہی دھمکی پورا کرنے کا وقت نہیں دوں گی۔
وہ ہر روز اپنے اس خیال کو مزید سے مزید پختہ کر رہی تھی اپنے اس خیال میں موجود مختلف ممکن خامیاں دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی اگر ایسا ہو گیا تو؟ اگر انہوں نے ویسا کر لیا تو۔۔۔؟ یہ لوگ بکتربند گاڑی کا انتظام تو کرنے سے رہے۔۔۔ اور میرے منہ پر کپڑا باندھنے یا ٹیپ لگانے سے بھی۔۔۔ وہ ہر سوچ ہر زاویے پر غور کر چکی تھی اور ہر مسئلہ کا مکمل حل نکال چکی تھی۔
یہ لوگ نہیں جانتے کہ مجھے یونین کے آفس لے جا کر یہ اپنی زندگی کی کتنی بھیانک غلطی کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ وہاں اپنی موت کو دعوت دینے جا رہے ہیں۔
تصور ہی تصور میں اس نے خود کو چلاتے پایا۔ پھر لوگوں کو اور سیکیورٹی گارڈز کو اپنی طرف بڑھتے لوگوں کو، احمد، غفار تایا کا گھیراتنگ کرتے۔ پولیس کو آتے اور ان باغیوں کو پولیس وین میں بند ہوتے۔ یہ خیال خوش کن تھا۔ اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔
وہ سوچنے لگی کہ ان پر کون کون سی دفعات لگ سکتی ہیں۔
حبس بے جا، تشدد، ظلم، اغوا، قتل، جائیداد کی غیر قانونی منتقلی، جعلی اقرار نامہ۔
پھر وہ سوچنے لگی کہ ان لوگوں کو کس کس طرح کی سزائیں مل سکتی ہیں۔ سزائے موت، الیکٹرک چیئر، زہر کا انجکشن، پندرہ سال قید۔۔۔ شعبہ زراعت کی طرف سے ملا یہ گھر، نوکریاں، احمد کا میڈیکل کیریئر۔۔۔ یہ لوگ پاکستان واپس جانے کے بند ہو چکے راستے کھوجتے پھریں گے۔
بیانکا کی ایک چیخ سب ختم کر دے گی۔ یہ لوگ ڈی پورٹ ہونے کی التجائیں کریں گے۔
اسے ہنسی آئی تھی کہ یہ لوگ کاغذ کے ایک پرزے پر دستخط کروا کر کتنے مطمئن ہو چکے ہیں اور اسے خود پر بھی غصہ آیا تھا اس نے کیوں اتنے دنوں اس کام کو لٹکائے رکھا بھلا اصل کام تو یونین کے آفس میں ہی ہونا تھا اور اب تو واقعی اصل کام یونین کے آفس میں ہی ہو گا۔
جب سارے پانسے بیانکا کے حق میں جائیں گے۔

تہہ خانے میں بھی کافی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔
اس کے لیے ایک بیڈ لگا دیا گیا تھا مزید لحاف فراہم کیے گئے تھے اور ایک برقی گرمالے (ہیٹر) کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا۔ کھانا بھی پہلے کی نسبت بہتر آنے لگا تھا۔ اگر ان چیزوں کا انتظام نہ بھی کیا جاتا تو جو کچھ وہ ان دنوں سوچ رہی تھی وہ اس کے ہر طرح کے آرام اور ذہنی سکون کے لیے کافی تھا۔
وہ بے چینی سے ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ چھٹیوں کے بعد کے پہلے ورکنگ ڈے اسے آفس میں حاضر ہونا تھا اور.... اور اس دن....
اس نے اپنے بلند بانگ قہقہوں کو بمشکل دبایا کہ کہیں وہ پاگل ہی نہ ہو جائے۔ پانچوں نفرت انگیز چہروں پر اسے ترس آیا تھا۔ جو عنقریب بیانکا سے رحم کی اپیل کریں گے۔
پیپر آنے میں مزید دس دن درکار تھے اور یہ دس دن اس نے خوش خوش گزارنا تھے۔

☼ ☼ ☼

پہاڑوں کی تلچھٹ میں کسی سنگ آہن وبا کا ظہور ہوا تھا۔ اس آہن کی کشش قیامت خیز تھی۔ جو شہرام کے پورے وجود سے لپٹ کر اس کو اپنی اور کھینچ رہی تھی۔
وہ نیچے کی اور سرکتا جا رہا تھا تیز تیز.... تیز تیز....
چاند نے اپنی روشنی بڑھائی تھی کہ اگر اسے ٹھوکر لگی تو بڑی جان لیوا ثابت ہو گی۔
لیکن شہرام کو کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ نوکیلے پتھروں نے اس کے جوتے پھاڑ دیے تھے۔ اس کے ہاتھ جھاڑیاں پرے کرتے کرتے چھل گئے تھے۔ گہری تاریکی اور چاند کی اعلیٰ ظرفی کے باوجود بھی اسے راستے نظر نہیں آتے تھے سوائے ایک راستے کے جو پاتال کی طرف جاتا تھا۔
"تم ہونہار تھے.... مجھے افسوس ہوا کہ تم بھی فریبی جذبوں کے پجاری نکلے۔" اسے بابا زلاری کی بات یاد آئی تھی۔

آنسوؤں کی نم لکیر جو اس کے دونوں گالوں پر ایک بار پھر نئے سرے سے گیلی ہونے لگی تھی۔
"کیا تم اتنے بہادر ہو؟"
اس کا سانس.... ہر سانس اس کے منہ سے کسی سسکی کی طرح برآمد ہونے لگا تھا۔
"پھر تو میں بھی تمہاری بے خوفی کو دیکھنا چاہوں گا۔ تمہاری ہمت اور جرات کو پرکھنا چاہوں گا۔"
وہ سرکتا جا رہا تھا۔ نیچے کی اور.... کسی بے وزن شے کی طرح.... کسی بے روح جسم کی طرح۔
"کسی اپنے پیارے کے سینے میں خنجر اتارنے کے لیے ہمارا جنون صرف چند لمحوں کا ہی ہوتا ہے۔"
"بابا آپ سب جانتے تھے آپ نے اس ادھورے راز کو میرے دل میں صیقل ہوئے خنجر کی طرح اتارا ہے۔"
وہ میلوں کا سفر طے کر چکا تھا لیکن تھکا نہیں تھا۔
زنگی ہٹر (کالی بلبل) کی پراسرار رہی تھی جو زغالی (بے جلے کوئلہ والی) رات کے ذروں پر اپنی بو پھونکتی تھی.... یہ تو گرمی حیات سے لرزاں تھی.... بے وزن.... لیکن خوفناک بھی۔
اور پھر اچانک وہ رک گیا۔
سنگ آہن وبا نے اپنی کشش روک لی۔
اس کی آنکھوں کے آگے کدام کا ایک گھنا اور.... سایہ دار درخت تھا۔ ایک فسوں خیز درخت.... جس کی ایک پرجاتی برگد سے ملتی ہے۔
برگد.... راجہ گدھ کا استعارہ۔
اور "پپال ساز" کا پیامبر۔
شہرام ایک ٹک اس شاخ کو دیکھنے لگا جو انسانی ہاتھوں سے کندہ ہو چکی تھی۔ گلاب کے پھول کے ساتھ لالے کا بے ڈھنگا پھول.... جیسے اس پر ہنس رہا تھا۔ اپنی جیت پر خوش تھا اور اس کی ہنسی میں ہتک تھی۔
"تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو.... جو لفظ تمہیں اتنی شرم دلا رہا ہے.... وہ عمل تم کیوں کر کر گزرو گے؟"
کوٹ کی اندرونی جیب سے اس نے ٹھنڈی سطح والا

تازہ صیقل کیا ہوا خنجر نکالا تھا۔ صدیوں پرانے خنجر کو.... جب کسی روز ڈوبتے سورج نے اس خنجر کے وار کو دیکھا اور سہا ہوگا۔

پھر یک لخت شہرام نے وہ خنجر کدام کے پیڑ کی شاخ پر مرتسم لالے کے پھول کے عقب میں اتار دیا تھا' پھول کی استہزائیہ مسکراہٹ لمحے بھر میں بگڑ گئی تھی۔

پتا نہیں یہ اس کے ہاتھوں کی لرزش تھی یا اسے "سان" پر صیقل ہوئے خنجر کا وار کرنا ہی نہ آیا تھا کہ خنجر کی تیز دھار لالے کے پھول کو چیرتی ہوئی فاصلے پر نقش گلاب کے پھول کی ایک پتی سے ٹکرائی تھی اور شاخ سے پھوٹتی حقیقت سے بھیانک حد تک قریب گلاب کے پھول کی ایک پتی مسخ ہوگئی تھی۔

شہرام ٹکٹکی باندھے اس مسخ پتی کو گھورنے لگا۔ جمع اوس کا ایک قطرہ اس پتی سے ٹپکا تھا۔

شہرام کی آنکھیں پھیل گئیں۔

اس قطرے کا رنگ سرخ تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سرخ خون جیسے قطروں کے بہنے کی رفتار متواتر ہوتی چلی گئی۔



سارا آسمان سلوٹ زدہ تھا گویا ریشم کے نیلے تھان کو کسی نے بلوری مرتبان میں بھر دیا ہو۔

بڑے دھندلے' انجان اور عجیب و غریب مناظر تھے جو ایک کے بعد ایک آتے چلے جا رہے تھے۔ جنہیں دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں آج صبح سے ہی اس کی آنکھیں درد کر رہی تھیں جیسے ان میں کوٹ کوٹ کر نیند بھر دی گئی ہو اور وہ سونے کی عادت کو ترک کر چکی ہو یا مدتوں سے بھولی بیٹھی ہو۔

اس نے اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دے لیے تھے۔ یہ صورت حال بھی عجیب تھی۔ جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی صبح سے ہی اسے سردی بھی کافی محسوس ہو رہی تھی۔

شاید وہ اس طرح کے موسم کے لیے ناکافی لباس میں تھی۔

اس کے پاس تایا غفار بیٹھے ہوئے تھے آگے احمد اور چچا جلال۔

وہ پیر کا دن تھا یونین کے آفس میں جانے کا دن۔

آنکھیں مسل مسل کر اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہم یونین کے آفس میں جا رہے ہیں ناں.... ہاں ڈیڈ کے اٹارنی بھی ہوں گے۔"

اس نے ایک بار پھر کمزور آواز میں تصدیق چاہی تھی۔ احمد نے ڈرائیونگ کرتے بیک ویو مرر سے اسے دیکھا تھا۔ اور تایا غفار نے ناگواری سے ہاں میں سر ہلایا تھا۔

اپنی بات کی تصدیق پر اس نے ایک بار پھر ذہن پر زور ڈالا اور یاد کرنے کی لاحاصل کوشش کی کہ اسے آج کے دن کا اتنی شدت سے انتظار کیوں تھا؟ وہ اس دن کے لیے ایک ایک دن کیوں گن رہی تھی۔

لیکن یہ بات بارہا یاد کرنے کے باوجود بھی اسے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہی تھی۔

دو گھنٹے کے تمام سفر کے دوران میں وہ تقریباً" ایک گھنٹہ یہ ہی کچھ سوچتی رہی تھی' آج اس کے پیٹ میں بھی درد ہو رہا تھا شاید اس نے آج باہر آ کر اپنے لیے دوائی لینی تھی یا شاید تایا غفار اسے حیفہ مام سے ملوانے لے کر جا رہے تھے.... سارے خیالات آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

سفر جیسے صدیوں بعد ختم ہوا تھا۔

گاڑی میں سے باہر نکل کر اس نے دیکھا۔ مختلف دوکانیں اور اسٹالز تھے۔ جن کے بیچوں و بیچ وہ کھڑی تھی۔ بہت سے لوگ تھے۔ بہت رش تھا جو اس کے اطراف میں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

ہاں کچھ کچھ ایسا ہی منظر اس نے سوچا تھا۔ دیکھا تھا آزمایا تھا لیکن کہاں؟ کب؟ وہ یاد نہ کر پائی۔

ساری یادداشتوں اور خیالات کو مجتمع کر کے اس نے اپنے قریب سے گزرتے ایک لڑکے کو پکارا تھا۔ اسے شاید کچھ ایسا ہی کرنا تھا۔

"جی میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

اجنبی اسے اجنبی نظروں سے دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھ رہا تھا۔ اور بیانکا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس نے اس لڑکے کو آخر کیوں روکا ہے۔ لڑکا کندھے اچکا کر آگے بڑھ گیا۔ تایا غفار سمیت سب ہی کار میں سے نکل کر اس کے پاس آگئے۔ چچا جلال نے اسے کسی مریض کی طرح پکڑ لیا۔ وہ واقعی گرنے والی تھی۔ ذہن پر کوئی دباؤ تھا شاید....

اندر آفس میں سیٹ پر بیٹھ کر اسے کچھ سکون محسوس ہوا تھا۔ اگرچہ تب بھی وہ تذبذب کے عالم سے ہی گزر رہی تھی کہ اس نے سڑک پر اس لڑکے کو روکا کس وجہ سے تھا۔ شاید کوئی ضروری کام تھا۔ جسے وہ اچانک بھول گئی تھی۔

کچھ سوالات ہوئے تھے جنہیں چچا جلال نے زور دار آواز میں دہرا کر بیانکا کو سمجھایا تھا۔ ڈیڈ الیاس کے اٹارنی (جو اب اس کا بھی اٹارنی تھا) نے بھی اس سے بعض معاملات کی تصدیق چاہی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی زہر خند سی مسکراہٹ تھی، بیانکا کو اس حالت میں بھی نہ جانے کیوں اس مسکراہٹ سے نفرت سی محسوس ہوئی تھی۔

اس کی جو سمجھ میں آیا وہ جواب دیتی گئی۔

پھر یونین کے ایک کارندے نے اس کے آگے ایک فائل کی تھی اور اسے انگلی رکھ کر سائن کرنے کو کہا تھا۔

اس نے قلم پکڑ لیا لیکن وہ کچھ لکھ نہ سکی۔

اسے سائن کرنے سے پہلے کچھ کرنا تھا، سائن کرنے تک کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی "آر یو آل رائٹ (کیا آپ ٹھیک ہیں؟)"

اس سے پوچھا گیا تھا۔

"جی..." اس نے بردبار لڑکی کی طرح جواب دیا تھا۔ اور آگے جھک کر ایک کاغذ پر سائن کر دیے تھے۔ صفحہ پلٹا گیا تھا اور دوسری طرف بھی سائن کرنے کو کہا گیا تھا۔

یقیناً" کسی اچانک ہوئے دھماکے کی طرح اسے یاد آیا تھا کہ اسے چلانا تھا... بے تحاشا۔

لیکن اسے ایسا کیوں کرنا تھا بہت چاہ کر بھی یہ بات اسے یاد نہ آسکی۔

اگر اس نے یہاں چیخ ماری تو کہیں یہ لوگ اسے پاگل ہی نہ سمجھ لیں، کوئی پڑھی لکھی لڑکی بھلا ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ ایک آفس میں بیٹھ کر یوں چیخنا چلانا اور جب کہ کوئی بات بھی نہ ہوئی ہو۔

اس نے دوسرے صفحے پر بھی سائن کر دیے۔ پھر تیسرے پر بھی۔

باقی کے آدھے گھنٹے کے دوران بھی وہ خود کو لعنت ملامت کرتی رہی تھی کہ آج کل وہ نہ جانے کیا کیا سوچنے اور منصوبے بنانے لگی ہے۔ اگر جلد ہی اس نے اپنی ذہنی حالت کو اپنے کنٹرول میں نہ لیا تو وہ پاگل بھی ہو سکتی ہے۔

وہ ایک بار پھر باہر آئی تھی اور تب ہی اسے یاد آرہا تھا کہ اسے سارے چلتے پھرتے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اپنے پاس بلانا ہے۔ اپنے اوپر ہو رہے ظلم کے بارے میں بتانا ہے۔

اس نے بے تحاشا شعوری جدوجہد کے بعد چیخنا چاہا تھا، لیکن اس کی چیخ کسی بڑبڑاہٹ سے زیادہ نہیں تھی۔

وہ واپس کار میں بٹھا دی گئی۔ سفر شروع ہوا ایک بار پھر سے... اور وہ لوٹ آئی... اپنے مدفن، اپنے مسکن، تہہ خانے میں اسی طرح پریشان اور ہر چیز بھولی ہوئی کہ جس طرح مجسم یہاں سے گئی تھی۔

رات کی تاریکی جوں جوں بڑھتی گئی اس کو دی گئی دوائی کا اثر زائل ہوتا گیا۔ سارے واقعات آہستہ آہستہ اسے یاد آئے تھے۔

اسے یاد آیا کہ صبح وہ آنے والے وقت کو لے کر بہت خوش تھی اور اسی خوشی میں اس نے صبح کا ناشتہ اور کل رات کا کھانا بھی خوب دل لگا کر کھایا تھا۔ ناشتہ بھی معمول سے ہٹ کر اور مزے کا تھا۔ وہ خوش نہ بھی ہوتی تو نہ جانے کتنا کھا جاتی۔

پھر آگے کیا ہوا۔

پھر یہ ہوا کہ اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔
آدھی رات کے بعد جب اس کے اعصاب پوری طرح جاگ گئے تو اس کے آنسو بھی خود بخود ہی جاری ہو گئے۔
"میں نے سب کچھ کھو دیا ڈیڈ... مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا گیا مام۔"
وہ بڑی دیر تک بے آواز روتی رہی تھی اور آنسو اس کا چہرہ بھگوتے رہے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں احمد کی تعلیمی قابلیت کی داد دی تھی۔ وہ واقعی ایک ماہر ڈاکٹر بننے والا تھا۔ اس کا علم کامل تھا۔



دود چراغ سی اٹی فضا میں گم وہ ایک ٹیڑھی بل کھاتی ڈھلوانی سڑک کے عین بیچ و بیچ بیٹھا تھا۔
اس کے رونے کی آواز اس قدر اونچی تھی کہ گیدڑوں کے غول اس آواز کے بھیانک پن کو سن کر دہشت سے چنگھاڑتے ہوئے ایک دوجے کو کسی انجانے خطرے سے خبردار کر رہے تھے۔
دور ایک ٹرک تیز رفتاری سے آتا ہوا۔ ہارن دیتا ہوا شہرام کے قریب بڑھتا چلا آ رہا تھا اس وزنی ٹرک کی دھمک اتنی دور سے بھی شہرام کے وجود کے نیچے تھرتھراہٹ پیدا کر رہی تھی۔
ہارن گیدڑوں کی چنگھاڑ اور شہرام کے رونے کی آواز نے فضا پر بڑا دہشت ناک ماحول طاری کر دیا تھا۔
پھر ہارن کی آواز میں انجن کی آواز بھی شامل ہو گئی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی... وہ وہاں سے نہیں اٹھا تھا۔
"اور اگر پھر بھی تم مطمئن نہ ہوئے تو؟" بابا زلاری نے اسٹور میں اس سے پوچھا تھا جب وہ سان پر خنجر تیز کر رہا تھا۔
"تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔" اسے اپنا جواب یاد آیا۔
"محبت میں سیاہ چوغہ پہن لینا آسان نہیں ہوتا... یہ پہن بھی لو تو نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

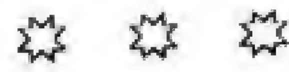
اس نے وہاں سے نہ اٹھنے کا جیسے عزم کر لیا تھا۔
دائیں طرف سڑک بالکل گھوم کر گول دائرے کی صورت پیچھے کو جاتی تھی اور وہاں سے تیزی سے آتے کسی بھی شخص کو ساری صورت حال کا اندازہ تب ہی ہونا تھا جب تک سڑک کے درمیان بیٹھے شخص کی ہڈیاں چور چور ہو چکی ہوتی تھیں۔
وہ بیٹھا رہا اور گھٹنوں میں منہ دیے روتا رہا۔ وہ آخری بار رو رہا تھا۔
"تم اپنے کام سے کام رکھا کرو شہرام... اپنی پڑھائی کا رعب مجھ پر ڈالنے کی کوشش مت کرنا۔" ولائی حسنی نے غصے سے کہا تھا۔ شہرام سن سا ہو گیا تھا اور اب دوبارہ یاد کر کے پتھر کا بن گیا تھا۔
"اب تم مجھے سکھاؤ گے اصول؟"
ولائی حسنی کو واقعی کوئی اصول سیکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے کمال کی بے اصولی جو کی تھی۔
"بدقسمتی میرے ساتھ تھی... میں آزمائی گئی اور آزمائش میں پوری نہ اتر سکی، مجھے بھٹکنا تھا۔ میں بھٹک گئی۔" سیرین نے کتنی آسانی سے اپنی بے وفائی کے معاملے کو قدرت اور قسمت کا نام دے دیا تھا۔
"میری خوشی اب تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔"

"وقت آنے پر تم جان جاؤ گے کہ وہ کون ہے۔"
شہرام جان گیا تھا اور یہ وقت کتنا برا تھا۔ اس کی آواز مزید اونچی ہو گئی تھی۔
تیتری نے اس آواز کو اپنی آواز پر غالب ہوتے دیکھا اور خاموش ہو گئی، صنوبر کے دیو قامت درخت اپنی شاخیں موڑ موڑ کر گردنیں جھکا جھکا کر اس گٹھڑی بنے جوان کو دیکھنے لگے۔
ٹرک اتنا قریب آ چکا تھا کہ اس کی روشنی بل کھاتی سڑک سے چھلک کر باہر کو لپکنے لگی تھی اور اندھیرے میں ڈوبے شہرام کا وجود واضح کرنے لگی تھی۔ وہ وہیں ساکت بیٹھا رہا۔
"کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا... زندگی بہت ٹھوس

اور ڈھیٹ ہے۔ یہ ہر حالت میں گھسٹتی ہے۔"
"نہیں ۔۔۔" اس نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا "اس زندگی کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ زندگی کے میدان میں پہلا کھیل، کھیل کر ہار چکا تھا اور یہ ہار ایسی تھی جس نے اسے مزید کسی کھیل کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی سانسیں اب ساری زندگی ہموار نہ ہونے والی تھیں۔ اس کا دل تڑپتے رہنے کو اپنا شعار بنانے والا تھا۔ ایسے میں اس نے جی کر کیا کرنا تھا۔"
ٹرک گھوم کر بالکل سامنے آ گیا تو وہ سر اٹھا کر اس کی تیز روشنی دیتی ہیڈ لائٹس کو دیکھنے لگا۔
بس چند لمحوں کی دوری اور پھر فنا ہو جانے کا ان چاہا ذائقہ ۔۔۔ شہرام نے آنکھیں بند کر لیں اور ان چند لمحوں کی دوری کو کسی نے بہت طویل کر دیا۔
دو مضبوط ہاتھوں نے اسے پکڑ کر اٹھایا تھا اور اوندھے منہ ڈھلوان پر لڑھکا دیا تھا۔
ٹرک گونجتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ تھوڑا سا لڑھک کر رک گیا تھا۔ لیکن اٹھا نہیں تھا ویسے ہی لیٹا رہا تھا، طامیر نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔
"تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟" وہ چلایا تھا۔
جواب دینے کے لیے شہرام کے پاس کچھ نہیں تھا وہ پاگل ہوا نہیں تھا، بلکہ کر دیا گیا تھا۔
"میں سمجھا تھا کہ تم بہادر ہو گئے ہو ۔۔۔ تم تو بزدل بھی نہیں رہے۔" طامیر غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔
"میں ۔۔۔ میں نہیں رہا ۔۔۔"
"اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میرے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی رہتا؟" وہ خود ہی نرم ہوا تھا۔ پھر اس نے شہرام کو ایک ٹیلے پر بٹھا دیا تھا۔
کافی دیر تک دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا تھا۔
"تو تم نے جان لیا کہ وہ ولائی حسنی ہے۔" شہرام چونکا تھا۔
"تم ۔۔۔ تمہیں پہلے سے پتا تھا ۔۔۔؟"
شہرام نے پوچھا تو طامیر نے نظریں جھکا لی تھیں۔
"ہاں!" بہت دھیمی آواز میں طامیر نے کہا۔ جیسے چاہتا ہو کہ شہرام سن ہی نہ سکے ۔۔۔ شہرام نے سن لیا۔

لیکن اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔
"اور کیا کیا جانتے ہو؟"
"دونوں دو ماہ پہلے نکاح کر چکے ہیں اور سیرین حسنی کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"
طامیر نے اٹکے بغیر کہا تھا۔ اب کچھ بھی چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔
آروہی کی گرہیں جو صبح کی دھوپ جالی پر دوبارہ بندھنے کے لیے نیند سے جاگ کر اپنا بناؤ سنگھار کر رہی تھیں۔ ان ساری گرہوں کو آن کی آن میں اجل کی ہواؤں نے آن گھیرا اور نوبت کے ٹوٹے ہوئے سرچاند کی لہروں میں گھل مل گئے۔
"وجہ بتا سکتے ہو؟" شہرام کی آواز دوسری دنیا کے پہاڑوں پر سے آتی محسوس ہوئی تھی۔
"ہاں ۔۔۔ سرکش اور منہ زور نفس ۔۔۔!" طامیر کے پاس وجہ بتانے کے لیے اس سے بہتر الفاظ نہیں تھے۔
"بابا جانتے ہیں؟"
"ہاں ۔۔۔ صرف خالا زتو یہ بے خبر ہیں۔" شہرام کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔
"لیکن اب نہیں رہیں گی۔" شہرام اٹھ کھڑا ہوا۔
طامیر بھی اٹھا تھا۔
"کہاں جا رہے ہو؟" شہرام کے قدموں کی چاپ تیز ہو گئی تو طامیر نے پوچھا تھا۔
شہرام چلتے چلتے رکا اور طامیر کے چہرے کو ایسے دیکھنے لگا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔
"وقت آ گیا ہے ۔۔۔ دوستی کا فرض ادا کرنے کا۔"
رات کی تاریکی میں شہرام کی آواز سناٹے کے ساتھ ساتھ خوف کی صورت سنائی دی۔ طامیر کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ کچھ اس آواز سے ۔۔۔ کچھ اس کے گالوں پہ بہہ کر سوکھ چکی۔ آنسوؤں کی لکیر دیکھ کر ۔۔۔
"تو پھر بولو ۔۔۔"
"میں روپوش ہونا چاہتا ہوں ۔۔۔ ہر ایک سے ۔۔۔ ہر اس شخص سے جسے میں جانتا ہوں ۔۔۔ چھپ جانا چاہتا ہوں ۔۔۔ اپنے آپ سے بھی ۔۔۔ تم سے بھی ۔۔۔ بابا ۔۔۔ اماں سے بھی ۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ۔۔۔ میری مدد کرو۔"

"بولو... کیا مدد چاہیے؟" طامیر اداسی سے بولا تھا۔
"مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ امریکا جانے کے لیے... اور گھر سے میرا پاسپورٹ... صرف پاسپورٹ... اور کچھ بھی نہیں۔"
شہرام نے کہا تو طامیر مزید افسردہ ہو گیا۔



بھاگ بھری سرد دھوپ کا ایک کھوکھلا چوکھٹا تھا۔ جو بڑے ہال نما کمرے کے نیم اندھیرے میں اس کی نظروں کے سامنے تھا۔
دروازے کے دائیں بائیں اور اوپر تقریباً" ادھ فٹ شیشے کے فریموں میں سے آتی تیز دھوپ اس کی آنکھوں میں گھستی تھی۔ اسے اس چوکھٹے کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ پر دروازے تک کا راستہ بہت لمبا اور پل صراط کی طرح تیز دھار تھا۔ اتنا کہ وہ ایک ایک قدم پر ایک ایک صدی جتنا سفر طے کر رہی تھی۔
اس کے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے اور اس کا جسم کسی دق زدہ مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ پرسوں دن سے آج صبح دہائی تک کے ان لمحات نے اس کے جسم کا سارا خون چوس لیا تھا اور وہ ایسی ہو گئی تھی جیسے شہد نکل جانے کے بعد خالی خولی کھوکھلا کھگا رہ جاتا ہے۔ سب کچھ ہار جانے اور کھو دینے کا غم اس قدر تباہ کن تھا کہ وہ اپنے آپ سے بھی نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔
یہ ان لوگوں کی باقی ماندہ شرافت اور رحم دلی تھی کہ وہ اسے سیدھے بھاؤ گھر سے باہر کر رہے تھے۔
اس کے دائیں طرف شہناز اور فیروزہ کھڑی تھیں۔ بائیں طرف چچا جلال اور تایا غفار... وہ ان چاروں کے درمیان میں سے گزر رہی تھی۔ سامنے نظریں گاڑے ہوئے... ان چہروں سے اسے اتنی نفرت ہو چکی تھی کہ وہ ان کو اب آنے والی زندگی میں خواب میں بھی دیکھ لے تو دونوں نہ سو پائے۔
شہناز نے اسے حیفہ کی شال پکڑائی تھی۔ بیانکا نے دھوپ کے چوکھٹے پر نظریں گاڑے وہ شال تھام لی تھی۔
"ہمارا طریقہ کار غلط ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنے حق کے معاملے میں ہمارا موقف بالکل درست تھا۔" چچا جلال نے اسے کہا تھا۔ اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ سیدھ میں چلتی رہی۔ ان باتوں پر تکرار اب لاحاصل تھی۔ اس کا وجود کسی اجڑی زمین کی طرح ہو چکا تھا۔ ایسی زمین جس پر ایٹم بم پھٹ چکا ہو اور جس پر پھر سالوں شجر کاری نہ کی جا سکے۔
فیروزہ نے اسے دو ہینڈ بیگ پکڑائے تھے۔ ایک خود اس کا اور ایک حیفہ ماہم کا۔ اس نے دونوں ہینڈ بیگز تھام لیے تھے۔ کمزوری کی وجہ سے دونوں ہینڈ بیگز اس کے ہاتھ میں جھولنے لگے تھے۔
"باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ وہ تمہیں حیفہ تک لے جائے گی۔" غفار تایا نے کہا اور ساتھ ہی دروازے کا ہینڈل نیچے کو گھما دیا۔
اور مقفل دروازہ کھل گیا... لیکن بڑی دیر کے بعد...
تیز پیلی دھوپ کی برچھی اس کی آنکھ میں لگی تھی۔ وہ تیزی سے بھاگ جانے کے انداز میں باہر جانے کے بجائے ایک قدم پیچھے کو ہوئی تھی اور بے اختیار ہی اس نے آنکھوں کے اوپر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ دھوپ بھی بڑی سازشی تھی۔ سب جانتی تھی اور جیسے بیانکا کے دشمنوں سے ہی جا ملی تھی۔
پھر آنکھوں کو آہستہ آہستہ دوبارہ کھولتے ہوئے وہ باہر کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے پیچھے کھڑے وہ چاروں دروازے تک آ کر اسے باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگے تھے۔
ٹیکسی کے پاس کھڑا احمد اسے باہر آتا دیکھ کر ڈرائیور سے کچھ کہتے کہتے رکا تھا۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سے نیچے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ گئی تو ڈرائیور نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ احمد پرے ہٹ گیا تھا اور ٹیکسی چل پڑی تھی۔
سڑکوں پر معمول کا رش تھا۔ ہر طرح کے لوگ ہر

روز کی طرح چل پھر رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ' کچھ خوش گوار موڈ میں' کچھ تاثرات سے عادی چہرہ لیے۔ بیانکا کا دل چاہا کہ وہ باہر نکل کر ان سب چلتے پھرتے لوگوں کے منہ پر چانٹے مارے' اور ان سب سے کہے کہ وہ بھی اسی طرح روئیں جس طرح اس وقت اس کا دل رو رہا ہے۔ پتا نہیں سفر زیادہ لمبا تھا یا موسم نے بدلنے میں وقت نہ لیا۔

بھاگ بھری دھوپ کی لہریں اب کالے اودے بادلوں سے الجھ رہی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا ماحول گندم کی سنہری بالیوں کے رنگ میں ڈھلتا چلا گیا۔ مناظر کو واضح طور پر دیکھنے کے لیے بیانکا کو اپنی آنکھیں بار بار مسلنی پڑتی تھیں۔ ہوا میں ٹھنڈے جھونکے بھی شامل ہو چکے تھے۔

پھر ٹیکسی رک گئی... ایک انجان جگہ پر...

ڈرائیور نے اتر کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ بیانکا کچھ نہ سمجھتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔ جس جگہ ٹیکسی رکی تھی' وہاں اسپتال تو دور کسی دو منزلہ بلڈنگ کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ اجنبی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھنے لگی۔ یہ جو بھی جگہ تھی بیانکا کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس جگہ میں پہچان کی چھاپ ضرور دفن تھی۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی بیانکا کو یاد نہ آیا کہ وہ پہلے یہاں کیوں اور کب آئی تھی۔

ڈرائیور اپنی سیٹ پر واپس بیٹھ چکا تھا۔ پھر اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ایک تہ کیا ہوا کاغذ بیانکا کی طرف بڑھایا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیانکا نے وہ کاغذ تھام لیا تھا۔

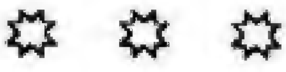
ٹیکسی ریورس ہوئی تھی اور پھر بیانکا کے دیکھتے ہی دیکھتے بہت دور نکل گئی تھی۔

کالے بادل کسی جلوس کی شکل میں اس کے سر کے اوپر آکر ڈیرا جمانے لگے تھے۔

جس وقت بیانکا نے وہ تہ شدہ کاغذ کھولا' تب تک اس پر بارش کی دو تین بوندیں گر چکی تھیں... اور... پھر اندر کی تحریر تو گویا "طوفان نوح" ہی لے آئی تھی۔

"ہم نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی' لیکن خدا کو شاید ایسا ہی منظور تھا۔ الیاس کے دائیں طرف حیفہ کی قبر ہے۔"

ڈزن... کی آواز کے ساتھ ساری دھرتی اس کے قدموں کے نیچے پھسلتی چلی گئی تھی اور کائنات کے سارے ستارے ٹوٹ کر اس کے اوپر آگرے تھے۔



اس کا چہرہ گیلی زمردی گھاس کے قطعات کے اوپر کسی بے جان شے کی طرح پڑا تھا۔ اس نم گھاس میں سے گیلی بوئے گل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ چوبیس گھنٹے اسی حالت میں پڑے رہنے کے باوجود اسے اس بو کی عادت نہیں ہوئی تھی۔ ہر آن بدلتی بو میں سے حیفہ مام کے وجود کی خوشبو اس کے وجود پر ایک نئی طرز سے حملہ آور ہوتی تھی۔ اس کے پاس نہ تلوار تھی۔ نہ میان اور نہ ہی ڈھال... وہ نڈھال ہوتی رہی۔

ژالے ملی بارش نے زمین اور اس کے لباس کو بری طرح سے گیلا کر دیا تھا' اسے یاد آیا... حیفہ مام کہا کرتی تھیں۔

"زندگی بہت چھوٹی' لیکن اس کے محسوسات بہت طویل ہیں... نہ ختم ہونے والے... صرف ایک بار نماز کسوف (سورج گرہن کے وقت پڑھی جانے والی نماز) پڑھ لینے سے زندگی کے اندھیرے روشنیوں میں نہیں بدلے جا سکتے... یہ نماز کسوف تو زندگی کے ایک باب میں ہی نہ جانے کتنی بار آتی ہے... تم تھکنا نہیں۔"

اسے زندگی کی نصیحت بھی کی گئی تھی تو کتنی تلخ... وہ تھکی نہیں تھی۔ لیکن بے بس' بے ہمت اور نڈھال ضرور ہو گئی تھی۔ ضرورت سے زیادہ... اور حیثیت سے بڑھ کر...

مٹی کی تازہ قبر پر لیٹے لیٹے روتے ہوئے وہ بارش کے باعث پوری طرح گیلی ہو گئی تھی۔ پھر شام ہونے لگی اور بارش رک گئی' وہ وہیں لیٹی رہی۔ اس کا غم بے کنار تھا۔

رات آئی اور اسے پتا بھی نہ چلا۔

صبح سے رات کا عالم ہی تو چل رہا تھا۔

وہ وہیں لیٹی رہی۔ دو آپس میں جڑی قبروں کے درمیان۔ جس میں سے ایک ڈیڈ الیاس کی تھی اور ایک حیفہ مام کی۔ وہ خود ان دو قبروں کے درمیان تیسری قبر بن جانا چاہتی تھی۔

سخت اذیت والی رات سردی کی شدت سے پر تھی۔ لیکن اسے احساس تک نہ ہوا۔ وہ ہر احساس سے ماورا ہو چکی تھی۔

صبح ہوئی تو اس کے وجود کے ساتھ ساتھ زمین بھی خشک ہونے لگی۔ وہ کھلی آنکھوں سے ساکت لیٹی رہی۔ گیلی مٹی کے داغ جا بجا اس کے لباس پر مردہ کیچوؤں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔

اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی تھی۔

وہ اس قدر بے حس و حرکت تھی کہ ننھی چیونٹیوں کی ایک لمبی لائن اس کے وجود سے ہو کر آگے گیلی قبر کے اندر دھنسی ہوئی مٹی کے اندر جا رہی تھی۔ وہ اس متحرک لائن کو دیکھتی رہی۔ بے روح بے نور آنکھوں کے ساتھ… دیکھتی رہی…

اور سورج طلوع ہو گیا۔ اس کی شعاعوں میں کل صبح والی تیزی نہیں تھی' نہ جگا دینے۔ جلا دینے' جھلسا دینے اور نہ پگھلا دینے کی طاقت… اس کا سنسناتا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔

خدا جانے زمین نیچے کی طرف کھسک گئی تھی یا بیانکا کی بینائی راتوں رات کمزور ہو گئی تھی کہ اپنے اوپر جھکتے ایک سائے کو بھی وہ نہ دیکھ سکی۔ نہ ہی اس کی آنکھیں کسی طرح کے تاثر کا اظہار کر سکیں۔

وہ سایہ لاٹھی ٹیکتا ہوا نیچے بیٹھا تھا۔ اس نے بیانکا کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس کے بالوں کو پرے کیا تھا اور اس ایک ذرا سے لمس میں ہی اس کے ہاتھ نے اس کے دہکتے وجود کے مرض کو جان لیا تھا۔

"اتنا تیز بخار…" کانپتا ہوا بوڑھا رابن بڑبڑایا تھا۔

اس نے بیانکا کی سوختنی لکڑی جیسی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ جہاں سے مخمل مریم کی جڑیں باہر نکلی ہوئی لگتی تھیں۔

"مٹی کے ساتھ تب تک مٹی نہیں ہوا جا سکتا جب تک اوپر سے حکم نہ آ جائے۔" بوڑھے رابن نے پارہ زدہ انگریزی لہجے میں بڑے کام کی بات کی تھی۔ "یہ تمہارا جو کوئی بھی تھا اس کا نعم البدل دنیا میں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن وقت کا تقاضا اور خدا کا حکم یہ ہی ہے کہ خود کو زندوں میں شمار رکھو۔"

بیانکا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے کچھ سنا ہوتا تو یقیناً" کچھ کہتی۔

رابن نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تھا۔

وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا تھا۔ دو منزلوں پر مشتمل وہ پرانی طرز تعمیر کا گھر آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ اس گھر میں صرف دو افراد رابن اور اس کی بیوی کے علاوہ تیسرا کوئی جانور یا پرندہ بھی نہیں رہتا تھا۔

جس دن رابن بیانکا کو اپنے گھر لے کر گیا' اسی دن رات سے بیانکا کا علاج شروع ہو گیا تھا۔

بیانکا اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں جاؤ گے؟" طامیر نے شہرام کو گھر سے اس کا پاسپورٹ لا دیا تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق ایک بڑی رقم بھی زبردستی شہرام کے حوالے کر دی تھی۔

"امریکا…"

شہرام دو دن کے بعد امریکا واپس آ گیا تھا۔

پتا نہیں اس وقت اس کی ذہنی حالت کس طرح کے خطرے سے باہر تھی' یا خطرے کے اندر کہ وہ اپنی یونی ورسٹی اپنے اسپتال جانے کے بجائے نیویارک آ گیا تھا۔ کسی شناسا چہرے کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی اور کسی اپنے کو ملنے کی اسے چاہ نہیں رہی تھی۔

طامیر کو رتی برابر بھی شبہ ہوتا کہ شہرام امریکا جا کر اس طرح بھٹکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو وہ کسی صورت دوستی کا فرض سمجھ کر کیے گئے کام کو نہ کرتا اور نہ ہی شہرام کو ادھر سے باہر نکلنے دیتا… لیکن جو کچھ ہوتا گیا' وہ شہرام کے لیے بھی بلا ارادہ ہی تھا۔

جب رہبر رہزنوں سے مل جائیں تو قافلے والوں کا بھی وہ ہی حال ہوتا ہے' جو اس وقت شہرام کا تھا۔ مزید لٹنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا... لیکن لٹ چکے قافلے کو اتنا دکھ اپنے نقصان کا نہیں ہوتا' جتنا وسیع وعریض دنیا میں بے راستہ و بے منزل بھٹکنے کا خوف...

وہ بھی بے راستہ و بے منزل ہو چکا تھا۔ لیکن بنا خوف زدہ ہوئے... سارا دن وہ آوارہ بادلوں کی طرح ادھر ادھر گھومتا رہتا بے مقصد... کبھی وہ گھنٹوں کسی پارک... بینچ یا بس اسٹاپ پر بیٹھے بیٹھے گزار دیتا... رات کے قیام کے لیے اسے زیادہ سوچ بچار نہیں کرنی پڑتی تھی۔ پارکوں' سڑک کنارے لگے بینچوں سے وہ آسانی سے رات بسر کرنے کا کام لیے جا رہا تھا۔ جو پیسے اس کے پاس تھے وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگے تھے' لیکن اسے قلاش ہو جانے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ محبت کے بدلے بے وفائی اور پشت کے وار کا سانحہ اس قدر غمگین کر دینے والا تھا کہ اب اجڑنے کا ڈر نہیں رہا تھا۔

وہ اس چیز کو لے کر ضرورت سے زیادہ لاپروا تھا کہ پیسے ختم ہو جانے کے بعد وہ اپنی گزر اوقات کیسے پوری کرے گا۔ شاید اس نے خود کو ختم کرنے کا یہ انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا۔

وہ چاہتا تو نیوجرسی پرنسٹن یونی ورسٹی واپس جا سکتا تھا' یا کم از کم اپنے کلاس فیلوز کے پاس تو جا ہی سکتا تھا' لیکن وہ یہاں بالکل کنگال اور بے یارومددگار ہو جانے کے بعد بھی وہاں جانے کی سوچ پر کوئی مثبت فیصلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔

پھر ایسے ہی دنوں میں سے ایک دن شائن کلب میں گر کر اس کا بازو فریکچر ہو گیا اور اسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کا کیا حال کر لیا ہے۔

"جو بے وفا ہیں ان کے لیے اپنی زندگی' اپنا کیریر داؤ پر مت لگاؤ۔" بابا زلاری نے اسے سمجھایا تھا اور جسے وہ اب سمجھا تھا۔

چند دن کے بعد اسپتال میں ہی جب اس نے اپنے بیڈ کی سائیڈ پر آبی للی کے پھولوں کا گلدستہ دیکھا تو جیسے بڑے لمبے عرصے کے بعد اس کا سویا ہوا دماغ جاگا تھا۔

"کیا یہ واقعی میرے لیے ہیں۔" اس نے نرس سے ایک بار پھر تصدیق چاہی تھی۔

"یس سر... یہ آپ کے لیے ہی ہیں... ایک لڑکی ان کو رکھ کر گئی ہے... کیا ان میں کوئی کارڈ نہیں ہے؟"

"نہیں... کوئی کارڈ نہیں ہے۔"

وہ حیران ہوا تھا کہ اس کے لیے ایک اجنبی شہر میں کون پھول رکھ کر جا سکتا ہے۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد پھر اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہو گئی تھی۔ وہ جو انسانوں سے کتراتا پھر رہا تھا' نہ جانے کس مانوس کشش کے باعث اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

زندگی کی طرف واپس آنے کے لیے اس لڑکی نے ہی اس کی مدد کی تھی۔ اسی نے شہرام کی رہائش کا بندوبست بھی کیا تھا... اور کتنا پیارا سا نام تھا اس لڑکی کا... بیانکا...



مفقود لڑکی... بیانکا۔

ایک ماہ بعد اپنے ہوش و حواس بحال کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

سب سے پہلے اس نے جس شناسا چہرے کو دیکھا وہ چہرہ کیتھی کا تھا۔ رابن کو نمبر دے کر اس نے کیتھی کو وہاں رچرڈ ہاؤس میں ہی بلا لیا تھا۔

"بیانکا..." کیتھی نے اس کی حالت دیکھ کر ایک بے اختیار سی چیخ مار دی تھی۔ "اوہ گاڈ... کیا ہوا بیانکا تمہارے ساتھ... تم تو حیفہ آنٹی کے ساتھ لبنان میں نہیں تھیں۔"

کیتھی کے اس ایک فقرے نے بیانکا پر اس کی غیر موجودگی کے سارے حالات واضح کر دیے تھے۔ ظاہری بات ہے جو لوگ ایک ایک چیز میں اتنے طاق

تھے 'وہ یہ پوائنٹ کیسے بھول سکتے تھے۔
"خدارا مجھے بتاؤ بیانکا... تمہاری اس حالت کے اسباب کیا رہے؟"
کیٹی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ رہی تھیں۔ تب بیانکا نے پہلی بار خود کو کسی اور کو ساری تفصیل بتانے کے لیے تیار کیا تھا۔
ڈیڈ الیاس کے قتل سے لے کر حیفہ مام کے قتل تک کی ساری کہانی... جسے سن کر کیٹی کے چہرے کے تاثرات لحہ بہ لحہ ہیبت ناک ہوتے جارہے تھے۔
"کیا حیفہ آنٹی... کیا حیفہ آنٹی کی ڈیتھ ہوگئی؟" کیٹی سب سن لینے کے باوجود بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔
"ہاں..." آنسو بیانکا کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔ کیٹی نے اس کے کانپتے وجود کو اپنی بانہوں میں سمولیا تھا۔
"تمہارے باپ کے خاندان والے اس قدر گھٹیا نکلے... صرف جائیداد کی خاطر انہوں نے اتنے ظلم کیے۔" کیٹی کی اپنی آنکھیں غم سے نم ہوچکی تھیں۔
"کتنا تلاش کیا... میں نے اور آریز نے تمہیں... تم لوگوں کا گھر بھی بند تھا... بڑی مشکلوں سے تمہارے پرانے اپارٹمنٹ کا ایڈریس حاصل کرپائے ہم لوگ... لیکن اپارٹمنٹ بھی بند تھا... اور وہاں کسی کو تم لوگوں کے وہاں شفٹ ہوجانے کی خبر بھی نہیں تھی۔ پھر احمد کے ذریعے ہی پتا چلا کہ تم اور حیفہ آنٹی لبنان جاچکے ہو... اپنے آبائی ملک... حیفہ آنٹی کے خاندان کے پاس... مجھے اور آریز کو تو یقین ہی نہ آیا کہ تم اور حیفہ آنٹی اس طرح اچانک بھی جاسکتے تھے 'بنا کسی کو کچھ بتائے... لیکن پھر سوچا کہ شاید کچھ مجبوری آگئی ہو... واپس آؤ گے تو پوچھوں گی کہ اس طرح اچانک جانے کی وجہ کیا تھی؟
جہاں تک مجھے یاد ہے 'اتنی دیر تک احمد ہی تمہاری پراپرٹی کو لک آفٹر کرتا رہا ہے... وہ کس قدر اطمینان سے تمہاری پراپرٹی اور اسٹور کا کیئر ٹیکر بنا رہا... یقیناً" اس نے جعلی لیٹر آف اتھارٹی بھی بنوا رکھا ہوگا... کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ لوگ اندر ہی اندر اس قدر گھناؤنا کام کررہے ہیں۔"
بیانکا خاموشی سے سنتی رہی تھی اور بے آواز روتی رہی تھی۔
"میں... میں تمہارا غم کس طرح ہلکا کروں بیانکا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" کیٹی خود کو لاچار محسوس کررہی تھی۔
"مجھے یہاں سے لے جاؤ کیٹی... مجھے گھر جانا ہے... آریز کو بلاؤ 'مجھے اس سے ملنا ہے۔"
"فی الحال ہمیں پولیس اسٹیشن جانا ہے۔" کیٹی نے کہا تو بیانکا نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔
"پولیس کے پاس جانے کا بھلا اب کیا فائدہ ہوگا کیٹی۔"
"یہ تم پولیس والوں پر چھوڑ دو... قاتل اور چور کہیں نہ کہیں اپنا سراغ ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔"
"وہ لوگ بہت بے خوف 'بہت گھناؤنے ہیں کیٹی... مجھے ان سے خوف..."
"تمہیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں... پولیس ہمارے ساتھ ہوگی۔"
"پولیس ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گی۔" بیانکا نے مایوسی سے کہا تھا۔
"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ کچھ چیزوں کو پولیس عام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتی ہے... یقیناً" کوئی حل نکل آئے گا۔"
"کوئی حل نہیں نکلے گا... وہ لوگ ہر صورت بچ جائیں گے کیونکہ وہ بہت سازشی ہیں۔"
"تم ہمت سے کام لو اور اٹھو... ہم دیر نہیں کریں گے۔ ہم یہ کام آج ہی کریں گے۔"
کیٹی 'بیانکا کے منع کرنے کے باوجود اسے لے کر اسی دن پولیس کے آفس گئی تھی۔ بیانکا کی ساری بات کو بہت توجہ سے سنا گیا تھا۔
"آپ ہمارے ساتھ چل کر اس گھر اور ان لوگوں کی نشاندہی کریں۔" آفیسر نے کہا تو بیانکا کو مزید حیرت ہوئی تھی۔ یہ درخواست ایک طرح کی کارروائی شروع

ہو جانے کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ بیانکا کی طبیعت جیسے کافی دنوں کے بعد ٹھیک ہوئی تھی۔

"کیا واقعی اب بھی کچھ ہو سکتا ہے۔" اس سوچ نے اسے ذہنی طور پر مستحکم کیا تھا اور کیٹی نے جیسے ایک ہی دن میں کوئی مشن مکمل کر لیا تھا۔

"اب دیکھنا ان لوگوں کو کیسی سزائیں ملتی ہیں۔ کسی کی ساری جائیداد کو نگل لینا اور قبل کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تمہاری حالت اتنے دنوں خراب نہ رہی ہوتی تو یہ کارروائی اگلے دن ہی سے شروع ہو جاتی' لیکن خیر ابھی بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ قاتلوں کی آزادی کے دن زیادہ نہیں رہے۔"

دو گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد وہ لوگ کنیکٹی کٹ کے مضافات میں بنا پھول والی سورج مکھی کی فصل والے تاحد نگاہ پھیلے کھیتوں کے درمیان بنے بڑے سے زرعی ہاؤس میں آئے تھے۔

اطلاعی گھنٹی بجانے کے بعد جو چہرہ برآمد ہوا بیانکا اس چہرے کو ہرگز نہیں پہچانتی تھی۔ وہ تو کسی درمیانی عمر کی مرد نما امریکی عورت کا چہرہ تھا۔

"مسٹر غفار... جلال اور احمد... کیا یہ ان لوگوں کا گھر ہے؟" پولیس کے ایک آفیسر نے پوچھا تھا۔

کیٹی اور بیانکا بھی گاڑی میں سے باہر نکل آئی تھیں۔

"نہیں' یہ ان لوگوں کا گھر نہیں ہے' یہ ان کا گھر تھا' اب یہ ہماری ملکیت ہے۔ محکمہ زراعت نے یہ گھر اب ہمیں الاٹ کر دیا ہے۔ وہ اس گھر کے پرانے رہائشی تھے۔" امریکی مرد نما عورت نے کہا تھا۔

"آپ لوگوں کو یہ گھر کب الاٹ ہوا؟"

تقریباً" چالیس دن پہلے... لیکن ہم لوگوں کو یہاں شفٹ ہوئے ایک ماہ ہی ہوا ہے... دراصل ان لوگوں نے گھر ایک ماہ پہلے ہی خالی کیا تھا۔ پاکستان جانے کے لیے ان کی سیٹیں کنفرم نہیں ہو رہی تھیں۔"

"پاکستان..."

فاصلے سے بھی اس نے یہ لفظ سن لیا تھا اور ایک بار پھر اس نے خود کو کائناتی بلیک ہول کے دہانے پر کھڑا پایا تھا۔

"آپ ہمیں اس گھر کے الاٹمنٹ کی فائل چیک کروا سکتی ہیں؟"

"جی ضرور..." عورت دروازہ بند کر کے اندر غائب ہو گئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ واپس باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل بھی تھی۔

پولیس آفیسر نے فائل کے صفحے الٹ پلٹ کر کے اسے جانچا تھا۔

"تو کیا وہ لوگ پاکستان جا چکے ہیں؟" فائل پر نظریں گاڑے بارعب پولیس آفیسر نے پوچھا تھا۔

"میری معلومات کے مطابق تو ایسا ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے... ہمیں وقت دینے کے لیے آپ کا شکریہ۔"

فائل پکڑ کر اور سر ہلا کر خاتون نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ افسردہ کیٹی نے سہارا دے کر بیانکا کو گاڑی میں واپس بٹھایا تھا۔ جو امید اس نے بیانکا کو دلائی تھی وہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ آنے والے دنوں میں بیانکا کو پتا چلا کہ ڈیڈ الیاس اور حیفہ مام کے محنت سے بنائے گئے سارے اثاثوں کو ان شیطان صفت لوگوں نے کیسے یکے بعد دیگرے اونے پونے بیچا اور پاکستان فرار ہو گئے۔ بیانکا نے دل میں انہیں ڈھیروں بددعائیں دی تھیں۔ تاہم قرار اسے پھر بھی نہیں آیا تھا۔

اور ان دنوں اس نے ایک بار پھر خود کو ذہنی توازن کھو دینے سے بڑے جتنوں سے بچایا تھا۔



مور پنکھوں سے سجی شام' دن کے چوبارے پر گھات لگائے چاند کے جام میں انڈیلی جانے لگی تھی۔ افق کی ست رنگی دھار معدوم ہوتے ہوئے اپنے مقسوم کے ہاتھوں مجبور ہو کر منتشر ہونے لگی تھی۔ اس نے بند آنکھوں میں نظر آتے روشنیوں کے الوہی نقطوں کی طرح اس منظر کو بڑے دل سے دیکھا اور گم ہو جانا چاہا تھا۔ اب تو ویسے بھی وہ ان ہی مناظر کی کا ایک

میں قید ہونے جا رہی تھی۔
ایک ایک کر کے اس نے آسمان کے رنگ دیکھے تھے۔ آخر بار... پھر سے سفید، بھوری، بنفشی، ارغوانی، زور آسا اور دھواں آسا غبار سا پھر اس نے کھڑکی کو بند کر دیا تھا۔

وہ نیند کی ڈھیر ساری گولیاں کھا چکی تھی۔
باتھ روم میں آ کر اس نے ٹھنڈے اور گرم پانی والے باتھ ٹب کے دونوں نلکوں کو پوری طرح سے گھما ڈالا تھا۔

اس کے پاس ایک سادہ سا وائٹ لباس تھا۔ آج شام کے لیے اس نے اس لباس کو ہی منتخب کیا تھا۔ وہ باتھ ٹب میں لیٹ گئی تھی۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کی اکٹھی دھار اس کے پاؤں پر کسی منہ زور جھرنے کی طرح پڑنے لگی تھی۔ ٹب آہستہ آہستہ بھرنے لگا تھا۔
اس نے پاؤں کو اونچا کر کے سر کو پوری طرح سے ٹب کی سطح پر لگا دیا تھا۔ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔

بیانکا خودکشی کرنے جا رہی تھی۔
اس اتنے بہت سارے گزرے دنوں میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔
"بیانکا! جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ گزرے وقت اور گزر چکے رشتوں کو کوئی واپس نہیں لا سکتا... اب بہتر یہ ہی ہے کہ تم صبر سے کام لو... اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو... اس کے علاوہ تم اور کچھ کر بھی تو نہیں سکتیں... تمہاری صحت کے لیے بھی ضروری ہے کہ تم باہر نکلو۔ اس طرح تمہارا ذہن بھی بٹے گا۔" کیٹی نے ایک دن اس سے کہا تھا۔
خود کیٹی کے لیے بھی اس طرح روز روز بیانکا کی طرف آنا اور اس کی دیکھ بھال کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی ایک چھوٹی بہن اور ایک بھائی کی واحد کفیل تھی اور اسے اپنی جاب سے اس طرح روز روز چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔
"دوسری یہ بات اب حقیقت ہے، چاہے تم اسے مانو یا نہ کہ اب تمہارے پاس زیادہ کچھ نہیں بچا... بینک میں موجود پیسے بھی اگر اسی طرح خرچ ہوتے رہے تو ظاہری بات ہے، ایک دن وہ سیونگ بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے... بھی... اور دوسرے اپنے خول سے باہر نکلنے کے لیے تمہیں کوئی کام کرنا چاہیے۔ میری ایک دوست ہے مارٹا... وہ کسی شائن نامی کلب میں کام کرتی ہے، وہ ہی مجھے وہاں کسی جاب کے بارے میں بتا رہی تھی، لیکن ایک تو مجھے میوزک کی کچھ زیادہ سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ دوسرا میں ایڈون کے گھر خوش ہوں، لیکن میں نے تمہارے لیے تم سے بنا پوچھے ہی مارٹا کو ہاں کر دی ہے، مجھے پتا ہے کہ تمہیں میوزک کا شروع سے ہی جنون رہا ہے۔
تم ڈی جے لائیو پرسنل اپیرنس (Live personal Appearance D.J) کی جاب بہت آسانی سے کر لوگی یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ مارٹا تمہیں سب سمجھا دے گی۔ میں نے اسے تم پر گزری ساری داستان بھی سنائی ہے۔ اسے تم پر گزرے سارے حالات پر بہت دکھ ہوا ہے، وہ تمہارے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرے گی۔
پائینیر Pioneer کو بس ایک آدھ بار سمجھنے اور اس کی (کیز Keys) کو یاد رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر یہ کام بہت آسان لگتا ہے۔ خصوصاً ان کے لیے جو میوزک کو بہت پسند کرتے ہیں۔ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے بیانکا؟"
بیانکا بیڈ پر نیم دراز مستقل طور پر چھت کو گھور رہی تھی۔ کیٹی کو شک گزرنے لگا کہ اس کی کسی بھی بات کو ذرہ برابر دھیان سے بھی نہیں سنا گیا۔
"بولو بیانکا... وہ کلب بھی زیادہ مصروف نہیں ہے۔ تمہارا کام یقیناً انہیں پسند آجائے گا۔"
"آرین... آریز کو یہ کام پسند نہیں آئے گا کیٹی!" بڑی دیر کے بعد بیانکا نے کہا تھا اسے کنوینس کرتے کرتے کیٹی نے رک کر منہ بنایا تھا۔
"کیوں اس میں ایسی کیا برائی ہے؟"
"ڈانس کلب کے ماحول زیادہ اچھے نہیں ہوتے..."

"تمہیں میں وہاں ڈانس کرنے کا تو نہیں کہہ رہی۔۔۔ اور ماحول تو انسان خود بناتا ہے۔۔۔ مارٹا کو بھی میں نے کبھی جینز اور ٹی شرٹ کے علاوہ کسی دوسرے ایسے لباس میں نہیں دیکھا جسے تم لوگ ذرا ناپسند کرتے ہو۔۔۔ باقی اگر تمہارا کام انہیں پسند آگیا تو تم اپنی ڈیمانڈز ان کے آگے رکھ دینا۔ جس طرح کے بھی تحفظات تمہیں درکار ہوں۔"

"آریز۔۔۔ کب واپس آئے گا کیٹی؟"

"ایسی سہل جاب بار بار نہیں ملتی۔ تم ابھی زیادہ ٹف کام کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"تم مجھے کسی بھی طرح آریز کا فرانس والا کانٹیکٹ نمبر لا دو۔۔۔ میرا اس کے گھر جانا مناسب نہیں ورنہ میں خود چلی جاتی۔۔۔ کیا پندرہ دن گزر نہیں گئے؟"

"وہ ابھی واپس نہیں آیا۔۔۔ اس کے ڈیڈ نے کہا تھا کہ اسے فرانس میں دس دن مزید لگیں گے۔"

"تو پھر اس کے آنے تک انتظار کرلو۔۔۔ میں اس سے پوچھ کر ہی کوئی فیصلہ کرسکتی ہوں۔" کیٹی سمجھ سکتی تھی کہ بیانکا کو اس وقت جذباتی وابستگی کی کتنی ضرورت تھی اور آریز کے علاوہ اب دنیا میں اس کے پاس بھلا بچا ہی کیا تھا۔

"اور اگر اس نے انکار کردیا تو؟"

"تو تم اپنی دوست کو بھی انکار کردینا۔"

"ٹھیک ہے، وہ آئے تو اس سے پوچھ لینا۔" کیٹی نے اسے اچھی طرح سے کمبل اوڑھایا تھا۔

"اب تم سو جاؤ۔۔۔ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔"

کیٹی نے ساتھ ساتھ تاکید کی تھی۔ بیانکا نے سونے کے لیے نیم وا آنکھوں کو بند کرلیا تھا۔

اگلے دن صبح صبح جانے سے پہلے کیٹی نے اسے بریک فاسٹ بنا کر معمول کی طرح بیڈ پر ہی دے دیا تھا۔ خود وہ بیڈ کے ایک کونے میں بیٹھ گئی تھی۔

"تم جاؤ کیٹی! تمہیں دیر ہو رہی ہوگی۔"

کیٹی اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی بلکہ وہ عجیب سی نظروں سے بیانکا کو دیکھنے لگی تھی۔

"میری بات غور سے سنو بیانکا!" کیٹی نے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔

بیانکا چونکی تھی، چچا جلال نے بھی فون پر اسے یہ ہی کہا تھا اور پھر بعد میں ڈیڈ الیاس کی موت کی خبر ملی تھی۔ بیانکا کے چہرے کے سارے رنگ یک دم نچڑ گئے تھے۔

"آریز فرانس میں نہیں۔۔۔ وہ یہاں ہی ہے۔۔۔ امریکا میں۔۔۔ دس دن پہلے وہ فرانس سے واپس آچکا ہے۔" کیٹی نے اپنے سابقہ انداز میں بات جاری رکھی تھی۔

منہ تک لے جاتا مفن بیانکا کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو کیٹی۔۔۔ تم کیا بتانا چاہ رہی ہو؟"

"تم تو ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں اس لیے میں نے تم سے آکر جھوٹ بولا کہ آریز ابھی بھی فرانس میں ہی ہے، جبکہ میں تمہارے پاس آتے وقت ایک دن آریز کے گھر چلی گئی تھی۔ میں نے ان کو وہ ساری باتیں بتائیں جو تم نے مجھے بتائی تھیں ان لوگوں نے سنا اور افسوس کا اظہار کیا۔ بعد میں میں نے آریز سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے تم سے ملنے کے لیے۔۔۔ تب ہی اس کے ڈیڈ اسے لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔۔۔ اندر جانے ان دونوں میں کافی دیر تک کیا بات چیت ہوتی رہی، بہرحال آریز پھر کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

اس کے ڈیڈ نے مجھے کہہ دیا کہ جو کچھ ہوا اس پر ان کو دکھ ہے، لیکن اب وہ اپنے بیٹے اور بیانکا کا ملنا پسند نہیں کریں گے۔"

میں تو شاکڈ رہ گئی اور میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں ان سے کیا کہوں۔ پھر بھی ڈھیٹ بن کر میں نے ان سے آریز کو بلوانے کا کہہ دیا جس پر انہوں نے صاف صاف انکار کردیا۔ میں واپس آگئی۔ اگلے دن صبح میں تمہاری یونیورسٹی گئی تھی۔ آریز سے ملنے۔۔۔ وہ مجھے ملا اور مجھے حیرت ہوئی جب اس نے بھی اپنے ڈیڈ والی

بات ہی کہی۔

"بیانکا اب ہمارے اسٹیٹس کے برابر نہیں رہی۔ میرے والدین اس رشتے کے لیے نہیں مانیں گے۔ اور میں ان کے سامنے ضد نہیں کرسکتا۔" تم جانتی ہو کہ میرے اور بیانکا کے درمیان کس طرح کی محبت تھی۔ یہ بس ایک تعلق تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ وقت آنے پر میں اس کی کسی بھی طرح کی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔"

یقین جانو! میرا دل چاہا میں اس خبیث کا منہ نوچ لوں، لیکن میں ایسا نہ کرسکی۔ میں اسے منالیتی اگر وہ مان جانے کے لیے تیار ہوتا۔ اس نے کہا اور چلا گیا۔ تمہاری حالت ٹھیک نہیں تھی' ورنہ میں تمہیں یہ ساری باتیں تب ہی بتادیتی' لیکن اب... لیکن اب ان باتوں کو چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں... میں تمہیں مزید اذیت نہیں دے سکتی۔ ایک نہ ایک دن تو تمہیں ان چیزوں کو فیس کرنا تھا۔"

کیتھی بہت کچھ کہہ کر خاموش ہوگئی اور دو آنسو بے تحاشا ضبط کرنے کے باوجود بھی بیانکا کی گھور سیاہ آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر پھسلتے چلے گئے۔

مشرق زوال کے سمندر میں آئے جوار بھاٹے سے نکل کر برآمد ہوا تھا۔ رنگوں کے سیل عکس جابجا پھیلنے اور پھسلنے لگے تھے۔ پرنور صبح اپنے آغاز پر تفاخر سے لبریز تھی' اس پرنور صبح کے تھال میں سے بیانکا نے اپنے لیے ایک جام اٹھانا تھا اور اس کے اندر اتنی سکت ہی تو نہ رہی تھی۔

"خود کو مضبوط کرو بیانکا!" کیتھی نے کہتے ہوئے اس کے شانے پر تھپکی دی تھی۔

"میں چلتی ہوں... مجھے دیر ہورہی ہے۔ شام میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔" کیتھی اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر اٹھی تھی اور دھیمی چال چلتے ہوئے دروازے تک گئی تھی۔

"کیتھی!" بیانکا نے رندھی آواز سے پکارا تو کیتھی نے وہیں کھڑے کھڑے گردن موڑی تھی اور سوالیہ نگاہوں سے بیانکا کو دیکھا تھا۔

"تم اپنی دوست سے بات کرو میں وہ ڈی جے کی جاب کرنے کے لیے تیار ہوں۔" جھکی آنکھوں سے بیانکا نے کہا تو کیتھی نے اسے فخریہ نگاہوں سے سراہا تھا۔

رات کو وہ دونوں شائن کلب میں تھیں۔

میوزک کی اسے جتنی بھی سمجھ تھی' وہ ساری اس نے کلب منیجر تھامس کو بتادی تھی' نئے پرانے البمز اور ملکی غیر ملکی سنگرز کے نام سمیت... کچھ سازوں کے بارے میں بیانکا کی معلومات حیرت انگیز تھیں' اگرچہ اس ساری معلومات کی اس جاب میں ضرورت تو نہیں تھی' لیکن یہ باتیں اس کے حق میں گئی تھیں... مارٹا نے اسے تین دن لگاتار آنے کے لیے کہا تھا تاکہ وہ Pioneer (پائیونیر) کے بارے میں اسے مزید اچھی طرح سمجھا سکے۔

چوتھے دن اس کا ٹیسٹ ہونا تھا جس کی بنا پر اسے وہ جاب ملنی تھی۔

وہ تین دن لگاتار آتی رہی تھی اور مارٹا کی مدد سے اس نے Pioneer چلانا سیکھا تھا' چوتھے دن یہ کام اس نے مارٹا کی مدد کے بغیر کیا تھا اور نیچے کھڑے ہجوم سمیت کلب کی انتظامیہ اور خود مارٹا بھی دنگ سی رہ گئی تھی۔

"کچھ انوکھا ہے... کچھ ایسا انوکھا جسے میں سمجھ نہیں پارہا۔" منیجر تھامس نے ٹریک ختم ہوجانے کے بعد اس سے کہا تھا۔

"تمہارا کام بہت اچھا ہے... تمہاری انگلیوں میں جادو ہے... لیکن کل سے سیڈ (افسردہ) گانوں کا انتخاب مت کرنا۔ فاسٹ میوزک اور زندگی سے بھرپور ٹریک کسی بھی کلب کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

اسے سراہنے کے بعد منیجر نے نصیحت کی تھی۔ جسے وہ بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

لیکن اگلے دن منیجر اور بیانکا دونوں اس وقت حیران ہوئے تھے جب نیچے ڈانس فلور پر کھڑے ہجوم نے اسے کل والا ٹریک چلانے کی ہی فرمائش خوب زوروں

شورسے کی تھی۔

اس کی انگلیوں میں Tishrei cloud (ابرنیساں) قید تھی۔ اس کے حوالے سے یہ بات پھر جلد ہی مشہور ہوگئی۔ یہ چیز اس کی ذات کی علامت بن گئی اور برسنے والے بادل سے بھلا کب کوئی یہ بات پوچھتا ہے کہ برس جانے کے بعد وہ خود کس قدر کھوکھلا ہو جاتا ہے۔

اس جاب سے اسے یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ذہنی طور پر قدرے نارمل ہونے لگی تھی' لیکن دو ماہ بعد اس کے سارے زخم جیسے پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔

وہ ایک روڈ شو تھا جو ٹی وی پر چل رہا تھا۔ سڑک پر نظر آتے بہت سارے لوگوں کے ہجوم میں سے احمد کو پہچاننے میں اسے سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی نہیں لگا تھا اور وہ جیسے سانس لینا بھول گئی تھی۔

توکیا احمد امریکا میں ہی تھا۔ کیا وہ پاکستان نہیں گیا تھا یا کوئی بھی پاکستان نہیں گیا تھا' بلکہ وہ سب امریکا کی ہی کسی اور ریاست میں منتقل ہو گئے تھے۔ بیانکا یہ بات اگلے دن پتا کرپائی تھی کہ وہ روڈ شو فلوریڈا میں ہو رہا تھا۔

احمد اور سارے گھرانے کا پتا کرنا اب زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔ اگر وہ تب ہی پولیس کو کارروائی کرنے سے نہ روکتی تو ایئرپورٹ انکوائری کے ذریعے یہ بات آسانی سے پتا چل سکتی تھی کہ دراصل وہ لوگ پاکستان واپس گئے ہی نہیں۔

بیانکا نے ہر چیز کے لیے خود کو بہتر جانا تھا۔

"اب مجھے جلد بازی سے کام نہیں لینا... مجھے بھی اسی طرح کی پلاننگ کرنی ہے جیسے ان لوگوں نے میرے اور حیفہ مام کے لیے کی تھی۔" وہ بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔

اب غصے یا عجلت میں اٹھایا گیا کوئی بھی قدم اس کے کام کو خراب کرسکتا تھا' یا اسے منزل سے ہی کوسوں دور کرسکتا تھا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ غفار' جلال' احمد وغیرہ اپنا نیا گھر بار چھوڑ کر پھر سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں۔

تب انہیں دوبارہ ڈھونڈنا تقریباً" ناممکن ہوگا اور قدرت نے جو موقع اسے دیا ہے اسے وہ ضائع نہیں کرے گی' بیانکا نے کیٹی سے بات کی تھی۔

"یہ تو بہت بڑی گڈ نیوز ہے بیانکا! کہ وہ لوگ ابھی تک امریکا میں ہی ہیں۔ پر اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟ تم ایک بار پہلے بھی پولیس کو کارروائی کرنے سے روک چکی ہو۔" کیٹی نے پوچھا تھا جبکہ بیانکا کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

یہ بات تو طے تھی کہ وہ لوگ اس قدر چالاک تھے کہ ان کے پاس پولیس سے بچنے کے بھی ہزاروں طریقے ہوسکتے تھے اور بیانکا کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے انہیں زیادہ محنت کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ان لوگوں نے یقیناً" اس چیز کے بارے میں بھی کافی کچھ سوچ رکھا ہوگا۔

"پہلے مجھے کسی اچھے وکیل سے ملنا ہوگا۔ اس سے مشورہ کرنا ہوگا۔"

بیانکا نے ساری رات مزید سوچنے کے بعد اگلے ہی دن اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا تھا اور مزید ایک ہفتے تک وہ وکلا آفسز میں دربدر بھٹکتی رہی تھی۔

تقریباً" سب نے ہی اس کی بات کو سیریس ہو کر سنا تھا' لیکن وہ آگے سے اسے کوئی مشورہ نہیں دے پائے تھے۔

"مسٹر الیاس کا قتل صرف آپ کا قیاس ہے اور مسز حیفہ کا بھی... جائیداد کی منتقلی کے وقت آپ خود یوتین کے آفس میں موجود تھیں یہ بات ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ آپ اس وقت دوائیوں کے زیر اثر تھیں۔"

"ڈیڈ باڈیز کے پوسٹ مارٹم کروانے پر آپ تیار نہیں ہیں اور اگر ایسا ہو گیا اور رپورٹ میں واضح طور پر کوئی شہادت ان کے خلاف نہ گئی تو۔"

"مسز حیفہ کی موت الرجی کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ان کو سورج مکھی سے الرجی ہو اور اس بات سے آپ بے خبر ہوں۔"

"جس طرح کی کہانی آپ سنا رہی ہیں یہ کیس تو الٹا آپ پر بھی پڑ سکتا ہے کہ پہلے آپ نے اپنے ہی لوگوں کو مہنگے داموں اپنی پراپرٹی بیچی پھر اب یہ طریقہ اپنا کر واپس حاصل کرنا چاہ رہی ہیں۔"

وہ ساری زندگی کسی وکیل کے آفس میں نہیں گئی تھی اب گئی تو زندگی کی ایک نئی جہت سے متعارف ہو رہی تھی۔ مایوسی کے باعث بیانکا کا دماغ چکرانے لگا تھا۔

اپنا کیس وہ کسی عام سے وکیل کو دینا بھی نہیں چاہتی تھی ایسا کرنا کھیل کھیلنے سے پہلے ہی ہار جانے کے مترادف تھا۔

"کیتھی۔۔۔! تم مشہور زمانہ وکیل ایڈون کے گھر کام کرتی ہو نا۔ کیا تم میری ایڈون سے ملاقات کروا سکتی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔"

کیتھی نے بے دلی سے کہا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ یہ کام کس قدر مشکل ہے۔ مشہور زمانہ اور معروف ترین وکیل ایڈون سے سفارش کے ذریعے وقت مانگنا کیتھی کے لیے بہت کٹھن مرحلہ ثابت ہونے والا تھا۔

ایک ماہ کے سخت اذیت ناک انتظار کے بعد اس کی ایڈون سے ملاقات ہو پائی تھی۔ صرف بیس منٹ کی اور ملاقات کے اختتام تک بیانکا نے خودکشی کرنے کا پکا ارادہ باندھ لیا تھا۔

ایڈون کو ہائر کرنا بیانکا کی پہنچ سے کافی دور تھا۔ دوسرا روتے ہوئے جس انداز سے بیانکا نے ایڈون کو ساری کہانی سنائی ایڈون کو یہ کیس بڑا ہی جھول دار اور بیانکا ہی کوئی سازشی سی لڑکی نظر آئی۔ اور گھر واپس آتے وقت وہ ڈھیر ساری نیند کی گولیاں لیتی آئی تھی۔ وہ سب کچھ سمیت اب زندگی بھی ہار دینا چاہتی تھی۔

ٹب آہستہ آہستہ بھرنے لگا تھا پانی اس کے سر سے کان کی طرف آنے لگا تھا۔

وہ اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے سارے واقعات کو ایک ایک کر کے یاد کرنے لگی تھی نہیں یاد نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعات تصویروں کی شکل میں اس کی نظروں کے سامنے آنے لگے تھے۔

حیفہ مام نے کہا تھا ڈیڈ الیاس نے سمجھایا تھا۔

نہیں۔ اسے کوئی ایسی بات یاد نہیں کرنی تھی جس میں امید کی ذرا سی بھی چاشنی ہوتی' وہ مرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

اس کا سرہانی میں ڈوب چکا تھا۔

وہ نیند کی کیفیت میں گم ہو گئی تھی' وہ مرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ بھرے ہوئے ٹب کا تلاطم زدہ پانی بہہ کر نیچے فرش پر گرنے لگا تھا بیانکا پوری طرح اس میں ڈوب چکی تھی۔

"مجھ سے وعدہ کرو بیانکا۔۔۔! تم ایسا ہرگز نہیں کرو گی۔۔۔ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے تم ان لوگوں کو ایک پینی بھی نہیں دو گی۔" بیانکا کا وجود خوفناک حد تک ساکت تھا۔

"ان ساری چیزوں میں الیاس کے ہاتھوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ میں ان چیزوں کو کبھی ان کے ناپاک ہاتھوں میں جاتا ہوا برداشت نہیں کر پاؤں گی۔"

"تم ایسی سوچ کو بھی گناہ سمجھو گی۔"

"ہمت نہیں ہارنا میری بچی۔۔۔ گھبرانا نہیں۔۔۔ ورنہ تمہارے ڈیڈ الیاس کی روح پریشان ہو جائے گی۔"

ذہن کو ہر طرح کے خیالات سے پاک کر دینے کے باوجود بھی وہ ان باتوں کو جھٹک نہیں پا رہی تھی۔

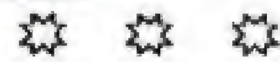
دفعتاً" رات کے جام میں انڈیلی جانے والی شراب کا رنگ سنہری ہو گیا۔ آہن گر سپاہیوں نے اپنی اپنی تلواریں میان سے نکال لیں۔ یہ اشارہ تھا۔ جنگ لڑنے کا آخری دم تک۔۔۔

پھر بڑی دیر کے بعد بیانکا کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی تھی اور پانی کا ایک بلبلا سطح تک آیا تھا۔

"ہمت نہیں ہارنا میری بچی۔۔۔ گھبرانا نہیں۔۔۔"

بیانکا ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور ٹب سے باہر منہ نکال کر اس نے بھرپور سانس لینے کے ساتھ ساتھ

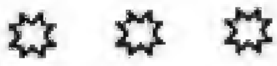
کھانسنا بھی شروع کردیا تھا۔
وہ ایسے کیسے مرسکتی ہے؟ وہ ایسے کیوں مرے؟
تاکہ اس کے دشمن ہر لحاظ سے مطمئن ہوجائیں؟
نہیں، وہ اپنی آخری سانس... اپنے خون کے آخری قطرے تک ان سے بدلہ لینے کی کوشش کرتی رہے گی۔
مجھے اس اندھیرے ماضی کو یاد رکھنا ہے۔ اس اندھیرے میں ایک چیز چمکتی تھی... حیفضہ مام کی آنکھوں میں آئے آنسو... جن کی یاد مجھے آگ کی طرح جھلساتی ہے... مجھے اس آگ کی آبیاری کرنی ہے... دنوں سالوں کے گزرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا... صدیوں کی لگاتار بارش بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کرپائے گی۔ یہاں تک کہ یہ آگ ایک تناور درخت بن جائے گی۔ ایک زہریلا درخت... پھر اس درخت پر ایک سیب اگے گا اور وہ زہریلا سیب گناہ گاروں کو چکھنا پڑے گا۔



ایک نارنجی خط نے ورق آفتاب کے تار کو کھینچ کر پورے آسمان کی وسعت پر پھیلا دیا تھا۔ مکمش سے بجے آسمان میں سہ پہر کے ارغوانی رنگ تحلیل تھے اور سیلاب نور میں ڈوبے ہوئے محل طوفانی روشن سراپے اوڑھے ہوئے تھے۔
دونوں خاموش ہوچکے تھے۔ اتنا سب کچھ بتا دیا گیا تھا کہ مزید کہنے کو الفاظ نہ ملتے تھے۔
"پھر یہ اس نے تمہیں واپس کردیا؟" بیانکا نے شہرام سے پوچھا تھا۔ خود اپنا ہی دھیان بدلنے کے لیے اس کے گلے پر لٹکے تعویذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور آنکھوں کی نمی کو انگلی کی پور سے صاف کرلینے کے بعد...
"نہیں، واپس نہیں کیا... بلکہ میرے منہ پر دے مارا..." خنجر کی دھار کی طرح کے تیز لہجے میں شہرام بولا تھا۔
"تو تم نے پھر یہ خود کیوں پہن لیا؟"

"اب میں صرف اپنے آپ سے محبت کروں گا یہ عہد کرنے کے بعد... میں نے اسے خود پہن لیا۔ میں اپنا محبوب خود ہوں۔ میں عاشق ہوں تو صرف اپنی ذات پر، فدا ہوں تو صرف اپنی زندگی پر۔"
شہرام کی بات کو سنتے ہوئے بیانکا نے اس کے کرخت چہرے کو دیکھا تھا۔
"جب ہمارے ساتھ کچھ برا ہوتا ہے تو ہم اپنی زندگی کے نئے عہد ضرور کرتے ہیں۔"
"کرنے بھی چاہئیں... کیا تم نے بھی خود سے کوئی عہد کر رکھے ہیں؟"
"ہاں... بہت سارے..."
"کیا... کیا میں جان سکتا ہوں۔"
"یہ ہی کہ انتقام کی آگ کو سب کچھ خاک ہوجانے سے پہلے راکھ نہ ہونے دوں گی۔"
شہرام چونک کر ایک ٹک بیانکا کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ اسے اس پتھر چہرے سے خوف سا آنے لگا تھا۔ جو ایک دم ہی اس کے معصوم چہرے پر پنجے گاڑے محسوس ہوا تھا۔
"تم نے عہد نہیں کیا... تم نے خود کو اذیت دینے کا سامان اکٹھا کرلیا ہے۔" بیانکا نے عجیب سی نظروں سے شہرام کی طرف دیکھا تھا۔ ان نظروں میں ایک قہر سا دبا ہوا تھا۔
"بابا زلاری تمہیں نہیں سمجھا سکے تھے اور تم مجھے نہیں سمجھا سکتے۔" شہرام لاجواب ہوگیا تھا۔
"میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ..."
"اب چلیں... کافی دیر ہوگئی ہے۔" بیانکا نے شہرام کی بات کاٹی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔
"ہاں... چلو..."
دونوں اکٹھے اٹھے تھے۔ دہکتی سہ پہر میں شام کی جوت جاگنے لگی تھی۔ ادھ کھلی کلیاں واپس بند ہونے لگی تھیں اور بھینی خوشبو میں حبس کا بے جا عمل دخل شروع ہوچکا تھا۔
وکٹورین طرز کے بنے آہنی گیٹ کی طرف بڑھتے

ہوئے شہرام ایک دم سے بیانکا کے آگے آیا تھا۔
"تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ تم بدلہ لو گی کیسے؟؟"
"ایک وکیل ہے... مجھے امید ہے کہ میں اسے اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے راضی کرلوں گی۔ وہ راضی ہو گیا تو مسئلہ صرف اس کی فیس کا رہ جائے گا۔ فیس کے معاملے میں اس کے اصول دوسروں سے مختلف ہیں۔ میں اس کی فیس کے پیسے ہی اکٹھے کر رہی ہوں۔ میرا میش اپ ہٹ ہو گیا تو یہ کام جلد ہی ہو جائے گا۔"
پارک کے دروازے سے نکل کر دونوں ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ سرد ہوا کے باعث پارک کا رش ختم ہو چکا تھا۔ سناٹے میں بیانکا کی ہیل کی آواز گونجنے لگی تھی۔
"میں تمہاری کامیابی کے لیے دعاگو رہوں گا۔" شہرام نے کہا تو بیانکا نے مسکرا کر شہرام کی طرف دیکھا تھا۔
"ہفتے کی رات کو کلب آؤ گے نا... وہ میش اپ کے ریلیز ہونے کا دن ہے۔" ٹیکسی کے اندر بیٹھتے ہوئے بیانکا نے پوچھا تھا۔
"ہاں... ضرور... کیوں نہیں... تمہاری زندگی کا انتہائی اہم دن ہے... میں بھلا اسے کیسے مس کر سکتا ہوں۔"
"تب تک شیو مت کرنا۔" بیانکا نے سنجیدہ لہجے میں عجیب سی بات کی تھی۔
"کیا..." وہ حیران ہوا بڑے معصومانہ انداز سے...
"کیوں..." اور نہ سمجھنے والے انداز سے وہ بیانکا کو دیکھنے لگا۔
بیانکا نے لمحہ بھر کو توقف کیا تھا اور یہ توقف شہرام کو بہت طویل لگا تھا۔
"شاید تمہیں معلوم نہ ہو... تمہاری شیو پر بالوں سے دو دائرے بنتے ہیں... اور... اور یہ تم پر بہت اچھے لگتے ہیں... خدا حافظ۔"
ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ وہی کھڑا ٹیکسی کی پشت کی دور ہوتی روشنی کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر بے اختیار ہی اس نے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر اپنی شیو کے بالوں کو محسوس کیا تھا اور مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی تھی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اس کی مسکراہٹ سے سچائی جھلکی تھی۔



بیانکا نہیں جانتی تھی کہ آسمان پر نظر آتے کبوتروں کے غول میں ایک زاغ آبی (آبی پرندہ) بھی ہے۔
ہفتے کی رات کو کلب کی اینورسری کے دن اس نے اپنا میش اپ ریلیز کیا تھا اور نتیجہ توقع سے بڑھ کر آیا تھا۔
میش اپ پر محنت کی گئی تھی جو اس کے ایک ایک سر سے جھلک رہی تھی۔ ساتھ ہی ویڈیو بھی ریلیز کر دی گئی تھی اور ویڈیو اپنی طرز کی مختلف ویڈیو تھی۔ جس میں میوزک کے ساتھ صرف رنگ بدلتے دکھائے گئے تھے۔ دراصل ایسا صرف کم بجٹ کی وجہ سے کیا گیا تھا اور بیانکا کو یقین بلکہ مجسم یقین تھا کہ اس کے مرتب کیے گئے گانوں اور دھنوں کو عوام کی پذیرائی حاصل کروانے کے لیے کسی اعلا ویڈیو کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ وہ اپنے تجربے کی بنا پر اس میش اپ کو دے چکی ہے وہ کسی کو بھی دیوانہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔
اس لیے اپنے میش اپ کی سی ڈیز مختلف میوزک کمپنیز کو بھجوا دی تھیں اور سوشل میڈیا پر اس کے میش اپ کو کافی مداح بھی مل چکے تھے۔ یہ سب ایک ہفتے کے اندر اندر ہوا تھا۔
شہرام بھی بیانکا کے لیے خوش تھا۔ کلب کی اینورسری پر میش اپ کی ریلیز سے لے کر وہ ہر نئے پڑاؤ پر بیانکا کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ بیانکا کو بس اب میوزک کمپنیز کی طرف سے ملنے والے ریسپانس کا انتظار تھا۔ آج کل اسے ہر چیز بڑی اچھی اور خوب صورت لگنے لگی تھی۔ ضیاریز (روشنی دینے والا) اس پر مہربان ہو چکا تھا۔ بڑے لمبے عرصے کے بعد اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔
لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا۔ روشنی کی دھاروں میں

سیاہی نہ جانے کیسے بھر دی گئی۔ کبوتروں کے غول میں جو ایک زاغ آئی بھی تھا تو رفتہ رفتہ وہ بھی سب کی نظروں میں آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا غول زاغ آئی سے بھر گیا اور وہاں صرف ایک کبوتر رہ گیا۔

یہ زاغ آئی برطانیہ سے آیا تھا۔ اسٹار لائٹ کا ہورائزن اسٹار لائٹ تین نوجوان خوب صورت لڑکوں پر مشتمل برطانیہ کا مشہور میوزک بینڈ۔۔۔ انہوں نے اپنا میش اپ ہورائزن جاری کیا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ ایسا عموماً ہوتا ہی ہے کہ ہر طرف لوگ اپنے اپنے کام کو لے کر کوششیں اور محنت کر رہے ہوتے ہیں لیکن بد قسمتی کا عنصر وہاں نمایاں ہوا جب بیانکا کو پتا چلا کہ اسٹار لائٹ کے ہورائزن میں موجود دس گانوں میں چار گانے وہ بھی ہیں جن کا انتخاب بیانکا نے بڑی محنت کے بعد کیا تھا۔

اس کا جو خیال تھا کہ اس کے منتخب کیے گئے گانوں کو لے کر امریکا کا کوئی بھی مخص میش اپ بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تو یہ خیال درست تھا۔ امریکا میں کسی نے واقعی ایسا نہیں سوچا تھا، لیکن اس کے خیال کی حدود برطانیہ تک نہ جاتی تھیں۔ اسٹار لائٹ امیر ترین گروپ تھا۔ ان کے میوزک کی کوالٹی کا بیانکا کے میش اپ سے بھلا کیا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ اسپیڈ اجوف قابل لڑکا تھا اور اس کی کمپنی اچھا کام کر رہی تھی، لیکن اسٹار لائٹ کے مقابلے میں وہ ابھی جدوجہد کرنے والی چیونٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ نہ جانے کس زعم، کس امید کے سہارے، بیانکا پھر بھی پر امید رہی۔

ہورائزن (افق) دیکھتے ہی دیکھتے افق پار کرنے لگا اور بیانکا کا میش اپ ارتھ کوئیک (زلزلہ) دن بدن ریکٹر اسکیل پر اپنی شدت پہلے سے کم ظاہر کرنے لگا۔

لاتعداد میوزک کمپنیز کی طرف سے بھی کوئی جواب نہ آیا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ بری طرح گری تھی۔ بس وہ اچھی طرح اٹھ نہ سکی تھی اور اس دن اس نے اپنی ہار کو تسلیم کر لیا، جب کلب کے منیجر تھامس نے اسے ارتھ کوئیک چلانے کے بجائے ہورائزن چلانے کا کہا۔

شہرام نے ایک طرح سے اسے سمجھانے، دلاسا دینے اور نئی امید دلانے کی کوشش کی تھی، لیکن بیانکا ان دنوں کوئی نصیحت سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اتنی ساری کوششوں، دعاؤں اور جدوجہد کے بعد وہ پھر سے ہار گئی تھی۔ یہ بات غم کے پہاڑ کی طرح اس کے ذہن پر سوار تھی اور یہ غم کا پہاڑ کسی اور طرف سرکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

تھامس کی ہورائزن چلانے کی ہدایت والے دن شہرام نے بیانکا کا ایک الگ ہی روپ دیکھا تھا۔ وہ بیانکا کو بہت نرم مزاج سمجھتا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ تہ خانے کی قید نے اس کی ساری نرم مزاجی کو ختم کر کے اس کے اندر تک تلخی اور نفرت بھر دی ہے۔ بیانکا نے تھامس کو اتنی کھری کھری سنائی تھیں کہ شہرام کو شک ہونے لگا تھا کہ دراصل تھامس بے چارہ دونوں کانوں سے بہرہ ہو چکا ہے۔

بیانکا نے بتایا تھا کہ صرف اس کی وجہ سے اس غیر معروف کلب نے ترجمانی کی ہے اور وہ جب چاہے جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ اس کلب سے بہت بڑی آفرز ہمیشہ اس کے پاس رہی ہیں۔

تھامس نے دوبارہ اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا لہجہ منت بھرا ہو گیا تھا اور بھرپور انداز میں معذرت کرنے کے بعد اس نے بیانکا کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ جس طرح کے گانے اور میش اپ چلانا چاہے چلا سکتی ہے۔ اس پر کسی طرح کی حدود لاگو نہیں ہوں گی۔

لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ منیجر کی بات سے بیانکا نے پورے ملک کے نظریے کو اخذ کر لیا تھا۔ وہ پیچھے رہ گئی اور اسٹار لائٹ کا ہورائزن آگے نکل گیا۔ اس نے بالآخر تسلیم کر لیا۔

اپارٹمنٹ آکر وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی اور نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی بیٹھی رہی تھی۔ اس میش اپ کے لیے اس نے اپنی باقی ماندہ دولت کو بھی خیرباد کر دیا تھا۔ آگ میں جھونک دیا تھا۔

اب وہ صحیح معنوں میں مفلس۔۔۔ بلکہ مفلس تر

ہو گئی تھی۔
باتھ روم کا ٹب اسے شاید ایک بار پھر بلا رہا تھا۔
بند کھڑکی نیچے کی اتھاہ گہرائی دکھا رہی تھی۔
اس نے ایک نظر کھلے دروازے سے نظر آتے ٹب کی سفید اور شفاف سطح کو دیکھا اور پھر بند کھڑکی سے باہر نظر آتی رات کی تاریکی کو۔ اگر اس بار وہ ٹب میں جانے کے بجائے ایک ہی بار میں کھڑکی سے کود جائے تو؟ کھڑے ہو کر وہ گہری نظروں سے کھڑکی کا مشاہدہ کرنے لگی۔ کھڑکی کے شیشے پر اسے اپنا پریشان حال عکس نظر آیا تھا۔ دس انگلیوں نے اس کے بالوں کو بے ترتیب کر دیا تھا۔ اسے اپنا وجود خشک پتوں کی طرح بکھرا ہوا نظر آیا۔ وہ کسی سال خوردہ درخت کی طرح بس گر جانے کو تیار تھی۔ لیکن اس گرنے سے پہلے نہ جانے کہاں سے آتی روشنی کے ایک ننھے سے قطرے نے چکور شیشے کو منور کر دیا۔
اس گھر میں اگر ایک باتھ ٹب تھا تو کیا ہوا۔ اس گھر میں ان گنت آئینے بھی تو تھے۔ آئینے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔
اور پھر رات کے دو بجے عجیب بات ہوئی۔
بیانکا نے اپنا سب سے عمدہ لباس زیب تن کیا۔ پھر لباس کی مناسبت سے ہی اس نے جوتے پہنے اور جیولری کا انتخاب بھی اس نے خاص احتیاط سے کیا۔ گھر میں موجود سارے میک اپ کو اس نے کسی ماہر مصور کی طرح خود پر ملا تھا اور رولر سے بالوں میں کرل بھی ڈالے تھے۔
اس ساری تیاری میں دو گھنٹے لگے تھے۔
صبح چار بجے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کارنس کی لکڑی پر اپنی دونوں ہتھیلیاں جما کر اپنے جسم کا سارا بوجھ وہاں منتقل کیا تھا اور خود کو بڑے مفصل انداز سے دیکھنا شروع کیا تھا۔
لمبی پلکیں۔۔۔ بھرے بھرے ہونٹ۔۔۔ اور گہری سیاہ آنکھیں۔۔۔ اسے اپنے لبنانی ہونے پر ناز ہوا تھا۔
"یہ ہے وہ جام۔۔۔ تو یہ ہے وہ جام۔۔۔ جو بیک وقت شہد بھی ہے اور زہر بھی۔۔۔" خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔
اور اس رات دو اور حقیقتوں کا ادراک ہوا تھا بیانکا پر۔
ایک تو یہ کہ وہ کسی صورت سالے جریج (مس لبنان) سے کم خوب صورت نہیں ہے دوسری یہ کہ۔۔۔ جتنے پیسے اس نے میش اپ پر لگائے اگر خود پر لگائے ہوتے تو آج اسے اس طرح مایوس نہ ہونا پڑتا۔
ایک بے اختیار۔۔۔ دل فریب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی تھی۔ اس نے اپنی گردن اور چہرے پر لکسو کا اسپرے کیا تھا۔
آج اس کا خود کو بڑی دیر تک دیکھتے رہنے کا ارادہ تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ایمل رضا

آغوشِ حُب

وہ دلہن کے لباس میں تھی اور بدحواس سی گاڑی سے اتر کر بھاگتی ہوئی شہرام کے گھر پہنچی تھی۔ اس سے پہلے وہ سینٹرل پارک اور رفالی ریسٹورنٹ میں اسے تلاش کر چکی تھی' وہاں نہیں ملا تو اس کے گھر پر آگئی تھی۔ یہاں بھی اسے مایوسی ہوئی تھی۔ لینڈ لیڈی نے بتایا تھا کہ وہ اپنے ملک البانیہ واپس جا چکا ہے۔

بیانکا شہر کی مقبول ترین ڈی جے تھی۔ بظاہر خوش باش نظر آنے والی بیانکا کی روح میں گہرے زخم تھے جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

شہرام اس کے ہوٹل میں آیا اور ایک اتفاقی حادثے میں زخمی ہو گیا' تو اس کے بازو کی ہڈی میں فریکچر آگیا۔

بیانکا شہرام سے پہلی نظر میں متاثر ہو جاتی ہے۔ وہ اسپتال میں اس کے لیے پھول رکھ کر جاتی ہے۔ شہرام جو محبت میں ناکام ہو کر بری طرح شکستہ ہے۔ اس مہربانی پر چونک جاتا ہے۔

بیانکا نے مختلف گانوں کے ردھم سے ایک میش اپ تیار کیا تھا۔ جوزف کا خیال تھا اس میں افسردگی کا رنگ غالب ہے۔ یہ رنگ بیانکا کا اصلی رنگ تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

بیانکا کے والد الیاس احمد پاکستان سے امریکا آئے تھے۔ انہوں نے یہاں محنت کر کے اپنا مقام بنایا پھر لبنان کی حیفہ سے شادی کر لی۔ اب دونوں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ بیانکا' ساری جائیداد اس کے نام پر تھی۔

مُکمل ناول



ان کے گلے ہو جاتی ہے۔ الیاس احمد کی اچانک وفات ہو جاتی ہے۔ ان کے گلے

الیاس احمد نے پاکستان سے اپنے بھائیوں کو بھی امریکا بلالیا تھا۔ الیاس احمد کی ساری جائیداد ان کے نام پر ایک سرخ لکیر ہوتی ہے۔

الیاس احمد کی وفات کے بعد ان کے بھائی حیفہ اور بیانکا کو بلا کر کہتے ہیں کہ وہ الیاس احمد کی ساری جائیداد ان کے نام منتقل کردیں۔ ان دونوں کے انکار پر وہ انہیں تہ خانے میں بند کردیتے ہیں۔ بیانکا کا چچازاد احمد میڈیکل کا ریسٹورنٹ ہے۔ بیانکا کو شک ہے کہ وہ انہیں کھانے میں کچھ غلط دوائیں دے رہا ہے۔

شہرام سیرین کو نوٹ کر چاہتا تھا وہ اس کی منگیتر تھی۔ منگنی کے بعد شہرام پڑھنے کے لیے امریکا چلا جاتا ہے۔ جب واپس آتا ہے تو سیرین بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ شادی محبت ہر چیز سے منکر ہو جاتی ہے۔ شہرام کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی لڑکا ہے۔ وہ اس کا پتا لگا کر اسے مارنے کا تہیہ کرلیا ہے۔

حیفہ اور بیانکا کو اس کے چچاؤں نے تہ خانے میں قید کر رکھا ہے۔ بیانکا کو نشہ آور دوا کھلا کر یونین آفس لے جا کر جائیداد کے کاغذات پر دستخط کروا لیتے ہیں اور بیانکا اپنے پلان کے مطابق کچھ نہیں کرپاتی۔ حیفہ ماں کی خراب حالت دیکھ کر بیانکا دستخط کرنے کی ہامی بھر لیتی ہے۔

وہ اسے بتاتے ہیں کہ حیفہ ماں مرچکی ہیں اور ڈیڈ الیاس کی قبر کے برابر میں دفن ہیں۔ ذہنی اذیت بیانکا سے اس کا ذہنی توازن چھین لیتی ہے۔ وہ ایک ماہ کے علاج کے بعد ہوش میں آتی ہے اور سب سے پہلے کینی سے رابطہ کرتی ہے اور اسے ساری روئیداد سناتی ہے۔

سیرین، شہرام کو بتادیتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ وہ یہ رشتہ توڑنا چاہتی ہے۔ شہرام کو پتا چلتا ہے کہ "کوئی اور" اس کا اپنا بھائی حسنی ہے۔

بیانکا کینی کے کہنے پر پولیس کی مدد لیتی ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے چچا کی فیملی وہ گھر بیچ کر کہیں اور چلی گئی ہے۔ بیانکا کے بار بار پوچھنے پر کینی اسے آریز کے بارے میں بتاتی ہے کہ آریز نے اس سے تعلق ختم کردیا ہے اپنے والدین کے کہنے پر کیونکہ بیانکا کا اسٹیٹس اب ان کے برابر نہیں رہا اور پھر کینی کی ہی مدد سے وہ اس کلب کو جوائن کرلیتی ہے۔ D.J (ڈی جے) کے طور پر۔

شہرام بھائی جان لینے کے بعد خودکشی کی کوشش کرتا ہے، لیکن طامیر عین موقع پر پہنچ کر اسے بچالیتا ہے۔ شہرام واپس امریکا آجاتا ہے۔

بیانکا کا میش اپ ریلیز ہوتا ہے لیکن بیانکا کو کامیابی نہیں ملتی۔

تیسری اور آخری قسط

کینٹی اور اس کا باس ایڈون۔ مشہور زمانہ قابل وکیل یہ وہ دو کڑیاں تھیں جو بیانکا کو اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار کرسکتی تھیں۔

ایڈون اٹلی نژاد امریکی تھا۔ دس افراد پر مشتمل اس کا خاندان چالیس سال پہلے اٹلی سے مستقل طور پر امریکہ آکر آباد ہوگیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خاندان امریکہ کے ہی مختلف حصوں میں پھیلتا چلا گیا۔ اور نیویارک میں بس ایڈون ہی اکیلا رہ گیا۔

سنہری مونچھوں اور اطالوی خدوخال کا حامل ایڈون بچپن سے ہی تنہائی پسند اور کم گو واقع ہوا تھا۔ اس کی عجیب و غریب طبیعت اس کے والدین کے لیے بچپن سے ہی تشویش کا باعث بنی رہی تھی۔ کھلونوں سے کھیلنے کے بجائے۔ اسے ان کے کل پرزے الگ الگ کرکے رکھنے کا شوق رہا کرتا تھا۔

والدین کی ساری تشویش کسی طور درست بھی ثابت ہوئی تھی۔ وہ خاندان جو پھیلتا پھیلتا امریکہ کے ہی عوام میں رچ بس گیا تھا۔ اس خاندان کی نسل بندی ایڈون پر آکر ہوئی تھی۔

پچپن سال کا ہوجانے اور وکالت میں کامیاب وکیل بن جانے کے باوجود بھی ایڈون ابھی تک قومی اور موسٹ وانٹڈ کنواروں کی فہرست میں سب سے اول نمبر پر شمار ہوتا تھا۔ ایڈون نے کچھ عرصہ سیاست میں بھی شمولیت اختیار کی تھی۔ اور تب ہی وہ میڈیا کی نظروں میں آیا تھا۔ سیاست سے کنارہ کشی کیے ہوئے ایڈون کو بیس سال گزر چکے تھے۔ لیکن میڈیا والے ابھی تک اس سے منسلک خبروں کو چٹ پٹی بنا کر پیش کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

میڈیا والوں کی ان حرکات کی کچھ وجہ خود ایڈون ہی تھا۔ ایڈون کا غیر ضروری اور اوپرا سا سخراپن خصوصاً" اپنے ابھی تک کنوارے ہونے کا جواب تو وہ اس قدر برجستہ اور ہر بار نئے انداز سے دیا کرتا تھا کہ سننے والوں کو تھیٹر کا مشہور مزاحیہ کردار بابوچ یاد آجاتا تھا۔

ایک طبقے کا خیال تھا کہ دراصل اسے لڑکیوں میں دلچسپی ہی نہیں ہے۔ جبکہ بعض کا خیال تھا کہ اپنے مزاح بھرے جوابات کے پیچھے وہ نجانے کس کس غم کو چھپاتا پھرتا ہے۔ اور چند ایک کا خیال تھا کہ بچپن میں ہوئے کار ایکسیڈنٹ نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ شادی کرسکے۔

ایڈون نے آج تک ان میں سے کسی بھی بات کا سنجیدگی سے جواب نہیں دیا تھا۔ بیانکا نے اپنے مقدمے کے لیے ایڈون کا انتخاب کیا تھا۔ بہت ساری وجوہات میں سے ایک وجہ تو ایڈون کی شہرت تھی۔ دوسرا کینٹی کا اس کے گھر میڈ کی حیثیت سے کام کرنا۔ ایڈون اپنی تیس سالہ سروس میں آج تک کوئی مقدمہ نہیں ہارا تھا۔ ججز اس کے بہترین دوست تھے اور پولیس اس کا عملہ۔ اس کی کامیابی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس نے آج تک کوئی ایسا کیس نہ لڑا تھا جس میں وہ کسی مجرم کے تحفظ کی حمایت کرے۔

ان تمام باتوں کے باعث بیانکا کی نظر انتخاب اس پر آکر کہیں اور نہ ٹک سکی تھی۔ دوسرا جو چھوٹے بڑے دوسرے وکیلوں سے اس نے بات کی تھی تو ان میں سے آدھے تو بیانکا کا مقدمہ لڑنے سے سرے سے انکاری تھے اور باقی آدھوں سے بیانکا خود مطمئن نہیں تھی۔

بیانکا کا خیال تھا کہ شاید کینٹی کی رہنمائی اور طرف داری حاصل کرکے وہ اپنے مقدمے پر ہونے والے اخراجات میں کمی کروالے گی۔ مگر یہ بیانکا کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ ایڈون اپنے اصولوں کا اپنے کنوارے پن کی طرح پکا تھا اور کسی بھی شخص کے لیے وہ اپنی فیس میں سے ایک پینی بھی کم کرنے کا روادار نہ ہوتا تھا۔ بیانکا کو مایوسی ہوئی تھی اور بڑے دنوں وہ مایوس ہی رہی تھی۔

وہ اپارٹمنٹ سمیت ہر چیز بیچ دیتی اگر اسے اپنے دربدر ہوجانے کا خوف لاحق نہ ہوتا۔ دوسرا ایڈون کی فیس ان پیسوں کے ذریعے بھی پوری نہ ہونے والی تھی۔ بیانکا نے اپنے باقی ماندہ اثاثے بھی میش اپ پر اجاڑ دیے تھے۔

اب اس کے پاس ایک ہی طریقہ بچا تھا۔

یہ تیر اگرچہ اندھیرے میں چلنا تھا، لیکن آزمانے میں حرج ہی کیا تھا۔ اندھیروں سے بے خوف ہوئے اسے ایک عرصہ بیت گیا تھا۔ اپنی انگلیوں کا جادو وہ دیکھ چکی تھی۔ جو سب کو دیوانہ کردیتا تھا۔ اب اسے اپنے حسن کا جادو جگانا تھا، وہ اس میں کتنی طاق تھی اسے یہ دیکھنا تھا۔



"بیانکا! کیا تم رولنگ ڈم نامی جگہ کو جانتی ہو؟"

فون پر اسے شہرام کی آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دی تھی۔ شہرام نے صبح کے دس بجے اسے کال کی تھی اور بیانکا رات کی لیٹ نائٹ ڈیوٹی کے بعد صبح اتنی جلدی اٹھنے کی عادی نہیں تھی۔ اس کے سوکر اٹھنے کا وقت دن کے شام کی طرف گامزن ہونے کا وقت ہوتا تھا۔ کسل مندی سے آنکھیں کھول کر اس نے شہرام کی کال تو اٹینڈ کرلی تھی لیکن وہ

اپنے اعصاب نہیں حاضر کروائی تھی۔
"کہاں۔ شہرام۔ کون سی جگہ؟"
"وال اسٹریٹ سے منسلک ایک سڑک ہے۔ ایسٹھویارڈ سے زیادہ دور نہیں ہے۔"
"نام سن رکھا ہے میں نے۔ لیکن کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کیوں خیریت؟" وہ مکمل طور پر جاگنے کے لیے مزید کوششیں کرتے ہوئے بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔
"وہاں ایک قابل نام کا ریسٹورنٹ ہے بیانکا۔ تم نے جو ٹریٹ آج مجھ سے لینی ہے وہ تم اسی ریسٹورنٹ میں لے لو۔"
"اسی ریسٹورنٹ میں کیوں؟" وہ اب مکمل جاگ گئی تھی۔
"اس بات کا فیصلہ تو میں کروں گی کہ میں نے اپنی ٹریٹ کہاں لینی ہے۔" وہ کسی قدر شوخی سے گویا ہوئی تھی۔
"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں بیانکا! کہ تمہیں وہاں آکر مایوسی نہیں ہوگی۔ بلکہ تم میرے ٹیسٹ کی داد دو گی۔ اس ریسٹورنٹ کا باربی کیو بہت زبردست ہے۔"
"تو تم وہاں جا بھی چکے ہو۔"
"ہاں۔ کل رات۔ ایک خوشبو مجھے وہاں لے گئی تھی۔"
"کیا خاص بات ہے اس ریسٹورنٹ میں۔"
"مجھے نہیں پتا۔ دراصل میں جان ہی نہیں سکا۔ شاید تم کچھ اندازہ لگا سکو۔ مجھے تو وہاں کے شیف نے صرف ایک ہی بات بتائی ہے کہ وہ باربی کیو کرتے وقت میپل کی سوکھی لکڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن صرف ایک درخت کی لکڑی کی وجہ سے تو ایسی خوشبو، ایسا ذائقہ پیدا نہیں ہو سکتا نا؟ جیسا۔ جیسا۔؟
بیانکا چونکی تھی۔ شہرام کی آواز میں کچھ تھا۔ بھیگا ہوا سا۔ بکھو دینے والا سا۔
"شہرام! تم ٹھیک تو ہو۔؟"
"یہاں کے کباب بالکل زنتو بیہ لیاں کے بنائے کبابوں کی طرح ہوتے ہیں۔ پیار اور لگن سے بنائے ہوئے۔" اس کا سوال نظر انداز کرکے وہ بولتا چلا گیا تھا۔
بیانکا چند لمحوں کے لیے کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ اپنے دوست کے غمگین لہجے پر اسے دکھ ہوا تھا۔
"تو کیا تم آؤ گی بیانکا؟" اس کے بولنے کا انتظار کرتے کرتے وہ خود ہی پوچھنے لگا تھا۔
"ہاں۔ شہرام!" بیانکا انکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔
"ٹھیک ہے' آج شام پانچ بجے تک یہاں پہنچ جانا۔؟"
"ٹھیک ہے۔" فون بند کرکے وہ اٹھی تھی۔ اور غسل خانے میں چلی گئی تھی۔
شہرام کی طرف سے دی جانے والی یہ دعوت اس دن سے التوا پر چلی آرہی تھی۔ جس دن شہرام نے ایک معمولی سے اسٹور میں جاب شروع کی تھی' جاب شروع کرکے اس نے گویا اس بات کا اعلان کیا تھا کہ وہ زندگی کی طرف دوبارہ واپس آگیا ہے۔ بیانکا کو شہرام کی ذات کی یہ تبدیلی اچھی لگی تھی۔ بقول شہرام کے اس زندگی کی طرف لانے والی کوئی اور نہیں خود بیانکا تھی۔ جوان دنوں خود کو بمشکل زندوں میں شمار تھی۔
کچھ دن میش اپ کی تیاری' ریلیزنگ' بعد کی امیدوں اور پھر میش اپ کے ایک طرح فلاپ ہوجانے کی نذر ہوگئے تھے۔ اب بڑے دنوں بعد اندر ہی اندر نئے فیصلے کرلینے اور نئی امیدوں کے سہارے وہ ذرا سنبھلی تھی' تو اس نے ٹریٹ کے لیے آج کا دن منتخب کیا تھا۔
اس ٹریٹ پر جانے کی تیاری خود بخود ہی ہوتی چلی گئی تھی۔
چند ہفتے پہلے کی گئی خریداری میں سے ایک خوب صورت ڈریس بیانکا نے ابھی تک صرف اس لیے نہیں پہنا تھا کہ وہ اسے شہرام کے ساتھ دعوت والے دن پہن کر جانا چاہتی تھی۔ جوتے اور جیولری کے ساتھ بھی یہ ہی معاملہ ہوا تھا۔ پارلر سے وہ اپنے بالوں کو کٹوانے کا کام بھی بڑے دنوں سے ٹال رہی تھی۔ سو اس کام کو پورا کرنے کا فیصلہ بھی اس نے آج ہی کرلیا۔
پارلر سے واپسی پر اسے کافی دیر ہوگئی تھی۔ سارے آسمان پر سوائی مٹی کا خاکستری رنگ چھا گیا تھا۔ سرد ہواؤں میں ڈوبا ہوا سورج چاند کی طرح ٹھنڈا سرد اور پگھلے ہوئے سونے کی مانند سیال آمیز تھا۔
پھولوں کی کیاریوں کے درمیان بنی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے وہ اپنے اندر ایک نیا جوش نیا ولولہ محسوس کررہی تھی۔ نجانے کیوں۔ حالانکہ آج کا دن بھی تو باقی دنوں کی طرح کا ہی تھا۔
کسی انجانی خوشی میں گم وہ اپنا ہی میش اپ گنگناتے ہوئے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تھی۔ اب اس کے پاس تیاری کے لیے بہت کم وقت بچا تھا۔ شہرام نے اسے پانچ بجے کا ٹائم دیا تھا۔ اور اس ساری تیاری میں چار بج چکے تھے۔
"تم ریسٹورنٹ کا پتا نوٹ کرلو بیانکا۔ کہیں تمہیں وہاں پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔"
سیل فون کان اور کندھے کے درمیان جکڑ کر اس نے پتا نوٹ کیا تھا۔ اور پھر اس کاغذ کو نوٹ پیڈ سے علیحدہ کرکے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا' باہر شام رات کے قالب میں ڈھلنے لگی تھی۔ کھڑکی سے نظر آتی Fuchsia کی بیل کے بڑے پتے کاہی رنگ میں رنگنے لگے تھے۔ جب وہ مکمل تیار ہوتی تھی۔
اپارٹمنٹ کا دروازہ لاک کرتے وقت اسے خیال آیا کہ وہ اپنا ہینڈ بیگ تو اندر ہی بھول گئی ہے۔ لاک دوبارہ کھول کر وہ واپس اندر آئی تھی۔
وہ اسے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہوا نظر آیا تھا۔
ایک اچٹتی سی نگاہ ہینڈ بیگ کو اٹھاتے وقت اس نے دوبارہ اپنے سراپے پر ڈالی تھی۔ اور اپنی ہی تعریف پر کی گئی اپنے ہی اوپر فدا ہوجانے والی معصومانہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی تھی۔
تیار ہو کر تو میں واقعی سالے جریم سے کم خوب صورت نہیں لگتی۔
اس نے ہفتہ بھر پہلے خود سے بولا گیا فقرہ دوبارہ ذہن نشین کیا تھا۔ پھر اپنی ہی سوچ پر بھرپور انداز میں ہنستے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی تھی۔
اور تب ہی۔ تب ہی۔ اچانک ایک دم سے اس نے اپنے دل کو گھبراہٹ کے پنجرے میں پھڑپھڑاتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ پل بھر میں اس کی بہتی چال میں واضح جھول آگیا تھا۔ اور کسی انجانی پریشانی کے باعث کسی ذہنی الجھن۔۔۔ کی وجہ سے اس کی دونوں بھنوؤں میں گڑھے پڑگئے تھے۔
"میں آج اتنی تیار کیوں ہوگئی ہوں؟"
اس نے خود سے سوال کیا تھا۔ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اس کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کررہا تھا۔
"خود کے لیے۔" کانپتے وجود کے ساتھ اس نے خود کو جواب دیا تھا۔
"نہیں۔ شہرام کے لیے۔" اندر کے بت طناز کی صدائے کوہ بڑی دور تک پھیلی تھی۔
"وہ تو صرف میرا اچھا دوست ہے۔"
اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ یہ جھوٹ تھا۔ کہیں اندر ہی اندر وہ جانتی تھی۔
"اگر وہ ایسا نہ سمجھتا ہو تو۔؟" بت طناز قلب کے سارے امراض کا ماہر تھا۔
"تو پھر یہ سراسر اس کا قصور ہے۔ میری منزل کچھ اور ہے۔ مجھے اپنے مام ڈیڈ کو دوبارہ بچانا ہے۔ ان کے قاتلوں سے ان کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ اس کے علاوہ میں کسی اور راستے پر نہیں چل سکتی۔ خواہ وہ راستہ ان گنت رنگوں اور خوشبوؤں والے پھولوں سے ہی کیوں نہ سجا ہو۔"
"نادانی میں کسی سے روا رکھے گئے ظلم کی سزا بھی ایسی نہیں ہوتی جیسے سوچ سمجھ کر کیے گئے گناہوں کی سزا۔ پھر تمہارا احساب کتاب تو بے باق ہے؟"
"میں نے آج تک اس سے کوئی ایسی بات نہیں

کی۔ نہ اپنے کسی رویے سے ظاہر کی۔"

"اور اگر وہ آج کچھ کہہ دے تو۔ کوئی رویہ ظاہر کرے تو۔ پر امید ہو کر۔ تمہاری باتوں نے اور تم نے اسے مایوسی سے نکالا ہے۔ تمہارا وجود اس کے لیے آس ہے۔ اور انسان آس کو کبھی ختم ہونے نہیں دینا چاہتا۔ یہاں تو وہ درخت بھی نہیں جہاں خنجر مار کر وہ اپنا غصہ نکال لے۔"

پرے ہوتے ہوئے وہ دھم سے صوفے پر بیٹھی تھی۔ کمرے کی خاموش فضا پلک جھپکتے میں قبر کی طرح وحشت ناک ہو چکی تھی۔ بیانکا کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ اور اس میں اتنی طاقت ہی کہاں بچی تھی کہ وہ اٹھ کر کھڑکی ہی کھول سکے۔

"شہرام!" نکار میں دل کی دھڑکن قید تھی۔ اور یہ قید تہ خانے کی تھی۔ جس سے اسے ابھی تک رہائی نہ مل سکی تھی۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی بیانکا نے بہت سارے فیصلے کر لیے۔

ہینڈ بیگ سے فون نکال کر اس نے شہرام کو کال کی تھی۔

"بیانکا! کیا تمہیں جگہ ڈھونڈنے میں مسئلہ ہو رہا ہے۔"

"نہیں۔ شہرام۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تھا۔

"تو پھر کیا تم ابھی گھر سے ہی نہیں نکلی ہو۔"

"میں آج نہیں آسکتی شہرام۔" بڑے کڑے لہجے میں اس نے کہا تھا۔

"خیریت۔ اچانک کیا ہوا؟"

"معذرت نہیں کروں گی کہ کہتے ہیں کہ اچھے دوستوں میں لفظ معذرت نہیں ہوتا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا پڑ رہا ہے۔ میں ایک دو دن کافی مصروف رہوں گی۔ میرا سیل فون بھی آف رہے گا۔ میں واپس آکر تمہیں خود ہی فون کرلوں گی۔ خدا حافظ۔"

بنا شہرام کی بات سنے اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اور خود کو دو دن تک کمرے میں بند رکھنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اس کے اعصاب ابھی سے تھکنے لگے تھے۔ نہ جانے اس نے صحیح کیا تھا یا غلط۔ وہ اس بات کی کشمکش میں مبتلا نہیں تھی۔ نہ جانے آگے کچھ صحیح ہو گا بھی کہ نہیں۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔

دور بہت دور۔ خالی ریسٹورنٹ کی ٹیبل پر منتظر شہرام فون کان سے لگائے جیسے وہیں آہنی ساخت میں بدل گیا تھا۔ اس آہنی مجسمے میں سے دل کے بڑی زور زور سے دھڑکنے کی آواز آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼

مسٹر ایڈون کو متاثر کرنے اور اپنے غیر معمولی تعارف کے لیے بیانکا کے پاس کافی ضروری اور اہم مواد اکٹھا ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی ذات کی ایک نئی دنیا کھوج چکی تھی اور اب مکمل طور پر اس دنیا میں گم تھی۔ اب وہ مسٹر ایڈون سے اپنی ایک الگ اور مضبوط شخصیت کی حیثیت سے ملنے والی تھی۔

اس نے ٹوٹل پانچ ڈراموں کا انتخاب کیا تھا۔

دو برازیلین ڈرامے تھے۔ el clon (زہر) اور Dark circule (تاریک دائرہ)

دو اسپینش ڈرامے Santa Diabla (شیطان مقدس) اور Prohabita Pasion (ممنوعہ جنون)

اور ایک امریکی ڈرامہ Revenge (انتقام) تھا۔

شہرام کو پانچوں ڈراموں کے نام اور ان کے مطلب جان کر تھوڑا عجیب لگا تھا۔ پانچوں ناموں میں اذیت، انتقام اور منفی جذبے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ خاص کر بیانکا کے منہ سے Revenge ڈرامے کا نام سن کر شہرام کو ہلکا سا شاک لگا تھا۔ یہ وہ ڈرامہ تھا جس میں ہیروئن اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے آتی ہے۔ شہرام کو تھوڑا دکھ بھی ہوا تھا۔ بیانکا اس فیز سے باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔ لیکن پھر اسے اپنے پچھلے دن یاد کر کے محسوس ہوا کہ اس طرح سوچنے میں وہ کس قدر غلط ہے۔ بیانکا تو پھر ظاہری طور پر نارمل حالت میں

تھی جبکہ وہ تو تقریباً" تقریباً" پاگل ہی ہو چکا تھا۔ اپنے اور بیانکا کے حالات و واقعات کا موازنہ کرنے کے بعد شہرام نے دل ہی دل میں بیانکا کی ہمت کو داد دی تھی۔ شہرام کا صرف دل ٹوٹا تھا' جبکہ بیانکا تو اپنا سب کچھ کھو دینے کے بعد بالکل ہی تباہ ہو چکی تھی۔

ڈراموں کے ساؤنڈ ٹریک کو لے کر ایک اور میش اپ تیار کروانے کا مشورہ شہرام کا ہی تھا۔ بیانکا کو یہ خیال اچھا لگا تھا۔ آج تک اس طرح سے نہیں سوچا گیا تھا۔ وہ کچھ ایسا ہی انوکھا کرنا چاہتی تھی۔ شہرام نے یہ بیانکا پر چھوڑ دیا کہ وہ امریکا میں ریلیز ہو چکے ملکی یا غیر ملکی ڈراموں کی لسٹ اپنی پسند سے تیار کرے کہ وہ میوزک کے بارے میں اس سے زیادہ جانتی ہے۔

بیانکا نے دن رات لگا کر ایک ہفتے کے اندر اندر یہ کام کیا تھا۔ اس نے پانچ مشہور ڈراموں کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن ڈراموں کے ساؤنڈ ٹریک سن کر نہیں بلکہ ان کے ناموں کی وجہ سے۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ جیسے نام اس کے دل کو بھائے تھے' ویسے ہی ٹریک بھی اس کے من چاہے نکلے تھے۔ جو کچھ بھی تھا ان پانچ ڈراموں کے مجموعی ساؤنڈ ٹریک کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ صرف سانتا ڈی آبلہ کے ہی تمیں آفیشل ساؤنڈ ٹریک تھے اور یہ تمام کے تمام ڈرامے امریکا میں بہت پسند بھی کیے گئے تھے۔

اس نے میش اپ میں سربراہی کرسی پر سانتا ڈی آبلہ کو بٹھایا تھا۔ کیونکہ یہ وہ ڈرامہ تھا جس نے امریکا میں اپنی شہرت کے جھنڈے پچھلے سارے ہسپانوی ڈراموں کی نسبت سب سے زیادہ اونچائی پر گاڑے تھے۔

اس نے بینک سے لون لیا تھا۔ اب وہ قرض دار بھی ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے سارے مراحل بڑے سوچ سمجھ کر طے کیے تھے۔ وہ خود کو بدلنے جا رہی تھی۔

اپنے جہاں کو تبدیل کرنے کا تہیہ کر چکی تھی اور نئے عالم' نئی دنیا میں جانے کے لیے جو دروازہ کھلا تھا۔ وہ کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے والوں کے لیے نہیں بنا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس بار کے میش اپ کی ویڈیو میں وہ خود کام کرے گی۔

اسے اپنی ذات کا الگ تعارف بنانا تھا اور یہ کام اس کے لیے اب اتنا مشکل بھی نہیں رہا تھا۔

ڈراموں کے ساؤنڈ ٹریک کو لے کر میش اپ بنانے کا یہ طریقہ اگرچہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن بیانکا نے اپنے میش اپ کو کچھ اس طرح متعارف کروایا تھا کہ یہ ایک نئے اور نہ ختم ہونے والے ارتقا کی پہلی سیڑھی ضرور ثابت ہونے والا تھا۔

مختلف فیشن انڈسٹری کے میگزین اور اخبارات کے تھرڈ پیج پر اس کے میش اپ کے تذکرے پڑھنے کو ملنے لگے تھے۔ چند اہم اور غیر اہم تجزیہ نگاروں نے اس نئے عمل کو کھلے دل سے سراہا تھا۔ سارے حالات مکمل طور پر بیانکا کے حق میں گئے تھے۔ اس بار کی خوش بختی سے نہ صرف اسے فائدہ ہوا تھا بلکہ خوشی بھی حاصل ہوئی تھی۔

ایک اچھی خاصی رقم چھوٹے بڑے حصوں کی صورت میں اس کے ہاتھ آنے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی کامیابی کا کریڈٹ کس چیز کو دے۔ کیا واقعی میش اپ اعلا تیار ہوا تھا یا اس کی کامیابی کے سارے اسباب اس کے بدلے ہوئے روپ نے پیدا کیے تھے۔ ایسی سوچوں کو وہ یہ کہہ کر



اپنے ذہن سے جھٹک دیتی تھی کہ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے، اپنے مام ڈیڈ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے ہی کر رہی ہے۔

اس کا بینک کا لون بھی ادا ہو گیا تھا اور اس کی سیونگ بھی دن بدن بڑھنے لگی تھی۔

لیکن یہ ساری رقم ایڈون کو راضی کرنے کے لیے بہت کم تھی۔ درحقیقت اس کی کھو چکی پراپرٹی میں سے اگر ایڈون کی فیس ادا ہوتی تو باقی کا جو کچھ بیانکا کے پاس رہ جاتا تھا اتنا تو تقریباً" اس وقت بھی اس کے پاس تھا۔

لیکن اصل مسئلہ صرف پراپرٹی کی واپسی کا ہی تو نہیں تھا۔ اس کے دل کا قرار ان پانچوں کے انجام سے جڑا تھا۔ وہ ان پانچوں کو اس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی جو انسانی قدموں سے بہت بہت نیچے ہوتا ہے۔ وہ انہیں روند ڈالنا چاہتی تھی۔

انہوں نے حیضہ مام اور بیانکا کو قید کرنے کے لیے ہر طرح کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس طرح کہ بیانکا لاکھ کوششوں کے باوجود بھی سب کچھ ہاتھ میں لے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اب بیانکا کی باری تھی۔ اسے کہیں ذرا سی بھی غلطی نہیں کرنی تھی۔ کوتاہی کی گنجائش نہیں تھی۔ ورنہ وہ لوگ پھر بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکتے تھے اور بیانکا ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

بیانکا کو اندازہ نہیں تھا کہ قدرت اس پر اس قدر مہربان بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا کی روح جیسے اس کی رفیق بن گئی تھی اور سارے عوامل مل کر ہر مشکل کام کو اس کے لیے آسان کرنے لگے تھے۔

وہ ایک فیشن میگزین تھا۔ جسے ایڈون کے نفیس ہاتھوں نے کافی دیر سے تھام رکھا تھا۔

ڈراموں کے ساؤنڈ ٹریک کو لے کر بنائے گئے میش اپ کے اوپر لکھا گیا بمشکل ایک صفحے کا آرٹیکل پڑھنے میں اسے صرف چند منٹ ہی لگے تھے۔ لیکن اس آرٹیکل کے درمیان میں جو دو تصویریں دی گئی تھیں وہ تصویریں گھنٹہ بھر گزر جانے کے باوجود بھی اس سے پڑھی نہیں جا رہی تھی۔

ایک تصویر میں بیانکا نے ہیڈ فون لگا رکھا تھا اور Pioneer پر جھکی تھی۔ دوسری تصویر پروفائل اسٹائل میں لی گئی تھی۔

ایڈون کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے حسن کی انعان اپنے اندر کیسی قیامت خیز رمزیں رکھتی ہے اور گھنٹے بھر بعد میگزین کو سائیڈ ٹیبل پر رکھنے تک ایڈون پر یہ احساس پوری طرح سے غالب آ چکا تھا کہ اس نے ساری زندگی بغیر کسی وجہ کے تنہائی میں کیوں گزار دی۔

"کینٹی..." اس نے توقف کیا تھا۔

"میڈ کینٹی کو بھیجئے میرے پاس۔" قریب کی ٹیبل پر جوس کا گلاس رکھتی میڈ سے اس نے بڑے پرسوچ انداز سے کہا تھا۔ اس کی یادداشت کمزور ہوتی تو بیانکا سے ہوئی چھ ماہ پہلے کی ملاقات کو یاد کرنے میں اسے زمانے بیت جاتے۔ لیکن وہ ملک کا مشہور و معروف وکیل ایسے ہی تو نہیں بنا تھا۔

"جی سر... آپ نے بلایا۔"

کینٹی تھوڑی دیر بعد ہی حاضر ہو گئی تھی۔

"تمہاری... ایک دوست تھی بیانکا... جس سے ایک بار ملاقات ہو چکی ہے۔"

"جی سر!" کینٹی کا چہرہ خود بخود ہی روشن ہوا تھا۔

"کیا اس نے اپنا کیس کسی اور وکیل کو دیا تھا؟"

"نہیں سر!"

"تو پھر تم اسے دوبارہ بلاؤ... میرے خیال سے اس کے مسئلے میں میں اس کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔"

کمال مہارت سے ایڈون نے اپنے تازہ اندرونی جذبات چھپاتے ہوئے سنجیدہ اور ہمیشہ والے بردبار لہجے میں کہا تھا۔

"وہ خود بھی آپ سے ملنا چاہتی ہے سر۔" خوشی کے باعث کینٹی کی زبان سے پھسلا تھا۔

عین اسی وقت اس جگہ سے میلوں دور ادک...

بلڈنگ کے نیم اندھیرے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے شہرام نے اپنی گردن میں لٹکتے تعویذ کی لکڑی کو اپنی انگلی کی پوروں سے چھوا تھا۔ مسکراہٹ بھرے مگر بڑے پرسوچ انداز میں۔

"نہیں بیانکا یہ مجھے اس طرح واپس نہیں کرے گی۔ جس طرح سیرین نے کیا تھا۔" شہرام نے خود سے کہا تھا۔

بادل آج بڑے عرصے بعد اسے اجلے اجلے اور دودھیا پانیوں سے بھرے ہوئے نظر آئے تھے۔ وہ پچھلے چھ ماہ سے بیانکا کے ساتھ تھا اور یہ بات اس کے دل نے خود ہی طے کر لی تھی کہ بیانکا بھی اس کے لیے وہ ہی احساسات رکھتی ہے۔ جواب خود اس کے بھی تھے۔

باہر روشن دن میں ست بھرائی چڑیوں کا غول دی کی شکل میں اڑتا اڑتا قریب سے قریب آنے لگا تھا اور جب وہ غول بے انتہا قریب سے آ کر گزرا تو شہرام نے دیکھا کہ ان کے پروں پر ان گنت رنگوں والے پنکھ تھے۔ مور کے پنکھوں سے بھی زیادہ لشک دینے والے۔

اس کے کمرے میں موجود مصنوعی اور بوسیدہ پھولوں کی تازہ خوشبو پھیلتے پھیلتے باہر کو لپکنے لگی تھی۔ البانی نژاد معصوم شہرام... محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر... بیانکا کی محبت میں۔

☼ ☼ ☼

چراغ سے نکلتے دیو کی طرح گاڑھا دھواں آسمان پر چڑھ کر کسی نازنین کے تخیل کی طرح گم ہو جاتا تھا۔ وہ رات قہقہوں سے پیدا ہوئی لگتی تھی۔ بدقسمتی سے جس کے اختتام پر آنسوؤں کا سمندر موجزن تھا۔ بیانکا کبابوں کو ساس میں ڈپ کر کے پوری رغبت سے کھا رہی تھی۔ شہرام نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ وہ مایوس نہیں ہوگی اور اس کے ذوق انتخاب کی داد دے گی۔ آج وہ نہ جانے کتنا کھا چکی تھی۔

بھاپ چھوڑتے کبابوں کو وائٹ یوگریٹ اور چلی سوس کے ساتھ مکمل بے اختیار ہو کر کھاتے ہوئے

شہرام کو وہ آٹھ نو سال کی ایک معصوم بچی لگ رہی تھی جو دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز و بے پروا ہوتی ہے۔

"کیسا لگا سب؟" شہرام نے فخریہ انداز سے پوچھا تھا۔

"فن ٹاسٹک۔۔۔ سوپر۔"

چٹخارے سے کھاتے ہوئے اس نے انگوٹھے اور انگلی کا گول دائرہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

"ارجیر والوں کے نفیس ذوق کو ماننا پڑے گا۔ میں نے اس خوشبو اور ذائقے کے ذریعے آنٹی نتھوبیہ تک ایک ادھورا سفر مکمل کیا ہے۔"

شہرام کے چہرے کی خوشی پلک جھپکتے میں غائب ہوئی تھی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں ضرور نم ہو گئی تھیں۔ بیانکا جان گئی تھی کہ وہ آنٹی نتھوبیہ کے نام سے افسردہ ہو گیا ہے۔

"کیا تم اب بھی البانیہ واپس نہیں جاؤ گے شہرام۔" ٹشو سے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"جاؤں گا۔۔۔ لیکن وقت کا اندازہ نہیں کہ وہ وقت کون سا ہو گا۔"

"وہ تمہیں یاد کرتی ہوں گی۔"

"وہ مطمئن ہوں گی کہ وہاں رہ کر میں کسی طرح کی اذیت میں مبتلا نہیں ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ میرا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا ہے۔۔۔ ان کا تصور اسی طرح بندھا رہے تو ٹھیک ہے۔۔۔ ایسی حالت میں میری وہاں موجودگی ان کے لیے کسی دھچکے سے کم نہیں ہو گی۔ وہ خوشی سے بڑھ کر اداس اور غمگین ہو جائیں گی۔"

"میرین اور حسنی نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا۔ اس میں آنٹی نتھوبیہ کا تو کوئی قصور نہیں۔"

"جانتا ہوں۔۔۔ لیکن میرے ساتھ جو ہوا اس میں میرا بھی تو کوئی قصور نہیں تھا۔"

"کیا تم انکل زلاری سے بھی ناراض ہو کہ انہوں نے تم سے دونوں کا تعلق چھپائے رکھا۔"

"نہیں ان کے بتانے یا نہ بتانے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ میری تقدیر میں ایسا ہی ہونا لکھا تھا۔"

"ایکسلینٹ۔۔۔ تم آنٹی نتھوبیہ سے فون پر تو بات کر ہی سکتے ہو۔"

"ہاں۔۔۔ کروں گا۔۔۔ بہت جلد۔۔۔"

شہرام نے بظاہر سامنے لیکن نہ جانے کس طرف دیکھتے ہوئے ایک خاص انداز میں اور کسی بات کو ذہن میں رکھ کر کہا تھا۔ بیانکا کو اس کے لہجے میں کوئی چیز پوشیدہ نظر آئی تھی۔

"مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے شہرام۔"

"وہ ہیں ہی اتنی اچھی۔۔۔ دراصل شاید دنیا کی ساری مائیں ان کے جتنی ہی اچھی ہوتی ہیں۔۔۔ ماؤں کی محبت میں ایک عنصر درخت کی جڑ جیسا ہوتا ہے۔"

جڑ کو پتا ہوتا ہے کہ اس کی کس شاخ کو اس وقت پانی کی ضرورت ہے۔ مائیں ساری زندگی کے لیے اپنے وجود سے بنے وجود کے اندر مقیم رہتی ہیں؟"

"تمہیں درختوں کے بارے میں بھی کتنا علم ہے نا شہرام۔"

بیانکا نے موضوع بدلنے کے لیے کہا تھا۔ یہ باتیں ایسی اور ایسے جذباتی انداز میں ادا کی جا رہی تھیں کہ لحاتی طور پر بیانکا پھر سے اس تہ خانے میں بند ہو گئی تھی۔ اسے حیفہ مام ٹوٹ کر یاد آئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ لیکن بابا زلاری سے زیادہ نہیں۔"

"تو بتاؤ شہرام۔۔۔ کیا پیڑ صرف استعارے ہیں۔۔۔ صرف تشبیہات ہیں جذبوں کی یا ان کے اندر بھی راز چھپے ہوتے ہیں۔"

"ان گنت۔۔۔ ہماری سوچ سے زیادہ۔۔۔ اور ہم سے بھی زیادہ یہ زندہ ہوتے ہیں۔"

"تو کیا ان سے منسوب استعارے جھوٹے ہیں۔"

"نہیں وہ استعارے بھی تو پیڑوں سے محبت کرنے والوں نے ایجاد کیے ہیں۔ وہ ان کی زبانیں جانتے تھے۔"

"مثلاً"۔۔۔ بتاؤ مجھے۔"

"مثلاً۔۔۔" وہ ذہن پر زور دے کر بہت کچھ یاد کرنے لگا تھا۔

"مثلاً"۔۔۔ چند خوب صورت ترین درخت۔۔۔

پیپل انجیر کا ہم راز۔۔۔ خراش مہربان دوست۔۔۔ ارجن بانوں کا محافظ۔۔۔ دیودار۔۔۔ غازی۔۔۔ سپاہی۔۔۔ اشوک۔۔۔ محبت کا گلدستہ۔۔۔ املتاس۔۔۔ مشرقی شاعری کا دل پسند۔۔۔ امید کا درخت۔۔۔ کیری عطر دان۔۔۔ برگد درویش درخت۔۔۔ بوڑھا۔۔۔ سحر کار۔۔۔ کدام۔۔۔"

وہ رکا۔۔۔ اچانک سے ٹھٹکا یا شاید الجھ گیا۔

"کدام۔۔۔؟"

اور چپ ہو گیا اور کہیں کھو بھی گیا۔۔۔ بیانکا سمجھ گئی تھی کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہے۔

"اور یہ۔۔۔؟"

اس نے اسے متوجہ کیا تھا اور اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے آگے کو جھک کر شہرام کی گردن پر دھرے تعویذ کو چھوا تھا۔ ایسے کہ بیانکا کا ہاتھ شہرام کے سینے پر آ گیا تھا۔

اب کے شہرام مزید شدت سے چونکا تھا اور اس کا دل گویا پاتال سے نکل کر دھڑکا تھا۔ اگر اور صندل سے مہکا ہوا پورا کھیت اس کے سینے پر ایک نقطے کی شکل میں آ گیا تھا۔ آخری بار اس نے اپنے دل کی دھڑکن ارجیر کی پہاڑی اترتے وقت سنی تھی اور آج اسے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ ہمالیہ بھی سر کر لے گا۔

"یہ چیڑ (درخت) ہے۔۔۔ اپنی جڑ سے محبت کرنے والا۔"

شہرام کی نظریں خود بخود ہی جھکتی چلی گئی تھیں۔ بیانکا نے ایک جھٹکے سے ہاتھ اس کی گردن پر سے اٹھایا تھا۔ دونوں میں لمحوں کی خاموشی آ گئی تھی۔ جو بڑی طویل ثابت ہوئی تھی۔ بیانکا پر محسوسات کے جہان کا ایک نیا در کھلا تھا۔ اسے خود کو نارمل کرنے میں بڑے جتن کرنے پڑے تھے۔

"بیانکا۔۔۔"

شہرام نے پکارا تو بیانکا نے بڑی آہستگی سے پلکیں اٹھائی تھیں۔

"کیا تم۔۔۔ کیا تم مجھ سے۔۔۔؟"

شہرام نے سختی سے تعویذ کو اپنی مٹھی میں دبا کر بیانکا سے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"مسٹر ایڈون کو جانتے ہو۔ مشہور لائر تھے امریکا۔"

بیانکا نے اس کی بات کاٹی تھی۔ جو ادھوری بات شہرام کے لبوں میں دب کر دم توڑ چکی تھی۔ وہ مکمل اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ ایسی باتیں اکثر اوقات زبانوں کے تکلف کی محتاج نہیں ہوتیں۔ بیانکا کے اندر کے بہت ممتاز کی پیش گوئی غلط ثابت نہیں ہوئی تھی۔ شہرام واقعی کچھ کہہ دینے والا تھا۔ اسی لیے بیانکا نے فوراً اور بروقت حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"مسٹر ایڈون کو کون نہیں جانتا؟"

شہرام نے نرمی سے کہا۔ موضوع بدل جانے پر وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔ اس کے سارے خوش گوار منصوبوں کی جیسے دھجیاں اڑ گئیں۔ لیکن اس کی جھنجلاہٹ میں ایک گونہ اطمینان بھی تھا۔ اسے اپنے دل کی بات کرنے کے لیے مزید مہلت مل گئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ بہتر ماحول اور خوب صورت موضوع گفتگو میں یہ بات کر سکتا تھا۔

"وہ میرا مقدمہ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔"

بیانکا نے دھماکے کی صورت انکشاف کیا تھا۔

"مذاق کر رہی ہو۔" شہرام نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"مجھے اس کی ایگزیکٹ فیس کا تو علم نہیں۔۔۔ مگر اتنا اندازہ ضرور ہے کہ اگر تم پانچ چھ سال مسلسل کلب کی تنخواہ خرچ کیے بغیر جمع کرتی رہو تو شاید تب ہی اس کی فیس ادا کرنے کے لیے پیسے اکٹھے کر سکو گی۔"

"پیسے اکٹھے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرا مقدمہ مجھ سے فیس لیے بغیر لڑے گا۔"

"رئیلی۔۔۔؟"

"بالکل۔۔۔"

"اگر یہ بات سچ ہے تو مجھے حیرت ہے۔۔۔ کیا وہ اکثر اوقات اسی طرح کی فیاضی کا مظاہرہ کرتا ہے۔"

"بقول کنٹی کے یہ اس کی زندگی کا پہلا مقدمہ ہے جسے وہ فری آف کاسٹ کرنے کے لیے تیار ہوا ہے۔"

"پھر تم یہ بات کسی کو بتانا مت۔" شہرام ہنسا تھا۔
"ورنہ یہ معاملہ اخباروں کے پہلے صفحے کی زینت بن جائے گا اور بنتا رہے گا۔ شاید تم بھی رپورٹرز کو مطلوب ہو جاؤ اور اپنے دونوں میش اپ کی نسبت زیادہ شہرت حاصل کرلو۔"
"ہاں۔۔۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔۔۔ اخباروں میں میرا ذکر تو آئے گا ہی۔۔۔ میگزین بھی میرے انٹرویو کے لیے وقت مانگیں گے۔ ٹی وی پر میری فوٹیج بار بار چلے گی۔۔۔ سوشل میڈیا میری گفتگو، میرے سراپے سے بھرا ہو گا۔۔۔ میرے مقدمے کی ایک ایک روداد لوگوں کو ازبر ہو جائے گی۔ درحقیقت یہ مقدمہ سے زیادہ زبان زدعام ہونے والا ہے۔ موجودہ وقت میں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔"
بیانکا نے کہہ کر ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا تھا اور اس کے چہرے پر اداسی پھیل گئی تھی۔
"نہیں ایسی بھی بات نہیں ہے۔۔۔ تم تو کچھ زیادہ ہی سوچ کر بیٹھی ہو۔"
"تم نہیں جانتے۔۔۔ میں آنے والے وقت کو دیکھ رہی ہوں۔"
"تم یہ مقدمہ ضرور جیتو گی بیانکا۔" شہرام نے ہمدردی سے کہہ کر اس کا ہاتھ دبایا تھا۔
"ہاں۔۔۔ ضرور۔۔۔ یا شاید۔۔۔ لیکن کچھ اور بہت سا ہار جاؤں گی۔"
"مطلب۔۔۔؟"
وہ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ بیانکا لحہ بہ لحہ روپ بدلنے والی لڑکی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ ایک دم سے اداس ہو گئی تو شہرام حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا۔
"چلتے ہیں۔۔۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"
بیانکا اپنا ہینڈ بیگ پکڑ کر کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے سیٹ کی پشت پر پڑا فر کا کوٹ پہنا تھا اور دونوں ہاتھ اس کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔
دونوں چلتے چلتے فالی ریسٹورنٹ کی حدود سے باہر نکل آئے تھے۔
"پہلے ٹیکسی مجھے ڈراپ کرے گی۔ پھر تم اپنے فلیٹ جاؤ گے۔" بڑی دیر کے بعد بیانکا کا موڈ پہلے جیسا ہوا تھا۔ لیکن ابھی ٹیکسی بڑی سڑک پر آئی ہی تھی کہ بیانکا کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔
"وینم بلاک چلیے۔"
بیانکا نے ایک پوش علاقے کا نام لے کر ڈرائیور کو وہاں چلنے کا کہا تھا۔ کیتھی نے اسے بڑے پرجوش انداز میں ساری تفصیل بتا تو دی تھی۔ جسے سن کر وہ صبح سے ہی کافی خوش تھی لیکن پھر نہ جانے کیوں وہ شام تک ساری بات بھول گئی۔
"مجھے ایڈون سے ملنا ہے۔" شیشے سے باہر کی تاریک سرد رات کو دیکھتے ہوئے اس نے شہرام کو بتایا تھا۔
"یہ آفس ٹائم تو نہیں۔"
"مجھے اس کے گھر میں اس سے ملنا ہے۔ کیتھی کی وجہ سے میری تین چار ملاقاتیں ایڈون کے گھر میں ہی ہوئی ہیں۔"
پھر ٹیکسی جس جگہ رکی۔ اس جگہ کے لیے بنگلے کا لفظ بھی کہیں بہت چھوٹا اور دور پیچھے رہ جاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔
"امید ہے مجھے واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"
بیانکا کہتے ہوئے اتری تھی اور پھر شہرام کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندر چلی گئی تھی۔ شہرام وہیں گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس میں آتے خدشات اسے بے چین کرنے لگے تھے۔
سرد رات مدتوں سے کبھی ایک جگہ پڑے ہوئے پتھروں کی طرح ساکن تھی۔ وقت رکا ہوا یا شاید قطب شمالی کی طرح جما ہوا تھا، گھنٹوں کی سوئیاں بہت عجلت کا شکار ہو گئی تھیں، جبکہ سیکنڈوں کی سوئیاں اپنی جا جم سے آگے نہ بڑھ پا رہی تھیں شہرام کے لیے یہ وقت کاٹنا مشکل تر ہو گیا تھا۔
بیانکا بہت خوشگوار موڈ میں واپس آئی تھی۔
"چلیے۔۔۔" اس نے ڈرائیور سے کہا تو شہرام کو اس کی آواز میں گہرے سمندروں کا سا شور سنائی دیا تھا۔

"مجھے اپنے مقدمے کے سلسلے میں اس سے ملنا تھا۔"

بیانکا نے شہرام کو بتایا۔ جبکہ شہرام کی نظریں چاند کی طرح چمکتے ہیرے پر اٹکی ہوئی تھیں۔ وہ ہیرے کا ایک چھوٹا ذرہ بیانکا کی شہادت کی انگلی میں پرویا ہوا تھا۔ شہرام کو اچھی طرح یاد تھا کہ ریسٹورنٹ میں جس وقت بیانکا نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی گردن میں جھولتے تعویذ کو چھوا تھا تب وہ ہاتھ اور انگلیاں مکمل طور پر خالی تھیں۔

ہمت رکھنے اور بات کو بے ضرر جاننے کے باوجود بھی وہ بیانکا سے اس کے متعلق پوچھ نہ سکا۔

بیانکا نے اندر کی ملاقات کا احوال سنانے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی اس کی نظریں افق پار کے دھاروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کی منزل اس کے قریب تر آتی جارہی تھی۔ نفرت، غصے اور انتقام کا تناور درخت زمین پر اپنی جڑیں پوری طرح پھیلا چکا تھا۔ اسے اب وہاں زہریلا پھل لگنے کا انتظار تھا اور یہ انتظار بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔

باہر کے تاریک مناظر تارکول کی طرح کچھ زیادہ ہی تاریک ہو چکے تھے۔ قمقمی جڑی روشنیاں اپنی کم مائیگی کے احساس پر شرمساری تھیں۔

ٹیکسی اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے آگے رکی تو وہ بنا کچھ کہے باہر نکلی تھی۔ لیکن اتر کر اور چند قدم آگے بڑھ کر وہ واپس پلٹی اور کھوی تھی اور شہرام کی طرف والی کھڑکی پر اس نے اپنا چہرہ ٹکایا تھا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے اپنا دایاں ہاتھ شہرام کو دکھایا شہادت کی انگلی کو آگے بڑھا کر۔

"یہ۔ یہ کیا ہے؟"

"کوئی پاگل بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ رنگ ہے اور یہ اس کے اندر ایک بیش قیمت ہیرا فکس ہے۔"

"تمہیں۔ کیا تم نے اسے پرچیز کیا؟"

"نہیں۔ یہ مجھے ایڈون نے دی۔"

بیانکا نے کہا تو گھنے جنگلوں کی ہیبت شہرام کے چہرے پر آئی تھی۔

"تم پوچھ رہے تھے کہ ایڈون کی فیس میں کیسے ادا کروں گی؟"

وہ بات جسے سارے سفر کے دوران شہرام کو بتانے کی وہ اپنے اندر جرات نہیں رکھتی تھی اب نجانے کیسے بتا رہی تھی۔

"ہاں۔!"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے اس کا پرپوزل قبول کرلیا ہے۔ میں اس سے شادی کر رہی ہوں۔ اس مقدمے کی جیت ہی میری شادی کا گفٹ ہو گی۔"

بیانکا نے کس قدر خوشی اور ادا سے کہا تھا' یہ بات الگ کہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں ظافر یوسف کی موسیقی کا سارا اوردست آیا تھا۔

شہرام کے چہرے کے تاثرات کیا ہوئے تھے۔ وہ نہ جاننے کی غرض سے ہی بیانکا نے فورا" چہرہ پرے کیا تھا۔ اور پھر مزید کچھ کہے بغیر وہ بلڈنگ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شہرام ابھی تک بے حس و حرکت اسے پیچھے سے دیکھ رہا ہو گا۔

اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر وہ دھم سے صوفے پر بیٹھی تھی۔ جیسے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرکے آئی ہو۔ یا جیسے مریخ کے لمبے اور تھکا دینے والے سفر سے واپس لوٹی ہو۔ عجیب بات تھی۔ وہ بات جب صرف اس تک محدود تھی تب بھی اسے پریشان کر رہی تھی۔ اور اب جب اس نے وہ شہرام کو بتادی تھی تو اس کی بے قراری پھر بھی کم نہیں ہوئی تھی۔

اسے اس طرح بیٹھے بیٹھے کافی لمحے گزر گئے تھے۔ جب خاموش فضا میں گاڑی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز کسی بسمل پرندے کی کراہ کی طرح گونجی تھی۔

صوفے پر ساکن بیٹھی بیانکا جانتی تھی کہ یہ اس گاڑی کے انجن کے چلنے کی آواز ہے۔ جس میں شہرام بیٹھا ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

ایڈون بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

بے چینی اور اضطراب کی حالت میں اس کی یہ صورت حال آج پہلی بار ہو رہی تھی۔ ورنہ اپنی پوری زندگی میں وہ کسی مقدمے یا اپنی ذاتی زندگی کو لے کر جب کبھی بھی پریشان ہوا تو بند کمرے میں موم بتیاں روشن کرکے تنہائی میں وقت گزارنے کا عادی تھا لیکن آج کی پریشانی میں قدموں نے وہ سفر پکڑ لیے تھے جن کی شروعات تو امید و آس سے ہوئی تھی اور اختتام یقینا" خوشی پر ہونے والا تھا۔

"خدا کا شکر کہ تم آگئے جوڈتھ!"

ایڈون نے دور سے ہی جوڈتھ کو آتے دیکھ کر اونچی آواز میں کہا تھا۔ جوڈتھ کا چہرہ کامیابی کی خوشی سے دمک رہا تھا۔

"یہ دیکھیے۔"

جوڈتھ نے قریب آکر سرگوشی سی کی تھی۔ اور پھر شاپنگ بیگ میں سے ایک مضبوط ڈبے میں بند مخملی ڈبیہ کھول کر ایڈون کے آگے رکھ دی تھی۔

"میں غلط نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی مجھے جھٹلا بھی نہیں سکتا کہ نیویارک مال میں کوئی رنگ اس سے بڑھ کر بھی موجود تھی۔"

ایڈون انگوٹھی کو مخملی ڈبیہ سے نکال کر اشتیاق سے دیکھنے لگا تھا۔ جوڈتھ نے اپنی بات میں مزید اضافہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"اس کے انتخاب میں میں نے گھنٹوں کا وقت صرف کیا ہے۔ میں لیڈی نہیں ہوں لیکن پھر بھی میرا دل اسے پہننے کو کر رہا ہے۔ مس بیانکا کو یہ یقینا" بہت پسند آئے گی۔" جوڈتھ خوشی کے مارے بولتا چلا گیا۔

"اتنی وضاحتیں مت دو پیارے۔ کیا میں اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تمہاری نظر انتخاب کتنی دیر کے بعد اس پر ٹکی ہو گی۔ یہ واقعی۔ یہ بہت خوب صورت ہے۔ اتنی کہ اس کے لیے خوب صورتی کا لفظ بھی بہت چھوٹا ہے۔"

"مس بیانکا خود بھی اتنی حسین ہیں کہ ان کے آگے خوب صورتی کے سارے الفاظ معمولی ہو جاتے ہیں۔"

ایڈون نے بالآخر شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اور یہ وہ بات تھی جس نے تیس سالہ ایڈون کے پرانے اور چہیتے ڈرائیور جوڈتھ سمیت سارے محل کو خوشی سے نہال کر دیا تھا۔ نجانے کیسے یہ بات گھر کے ملازموں اور میڈ تک بھی پہنچ گئی تھی اور آج کیتھی سمیت سب کو بیانکا کی آمد کا انتظار تھا۔

ایڈون نے انگوٹھی واپس نہیں رکھی تھی وہ تصور ہی تصور میں اس منظر میں کھو گیا تھا کہ جب وہ یہ انگوٹھی بیانکا کو دے کر پرپوز کرے گا تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے۔

وہ سیدھی سادی سی لڑکی نجانے کیوں فیشن میگزین کے صفحے پر ایڈون کو بہت پیاری لگی۔ حالانکہ وہ اس سے براہ راست ایک ملاقات کرچکا تھا۔ جس میں اسے ہر ساعت یہ لگتا رہا کہ یہ لڑکی بس ابھی رو دے گی۔ تب وہ کسی حد تک ایک بکھری ہوئی لڑکی تھی۔ جسے کسی چیز نے مجبورا" سمیٹ رکھا تھا۔ پھر بھی جو کہانی بیانکا نے ایڈون کو سنائی اس نے ایڈون کو زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں ایسے لاتعداد کیس ہینڈل کیے اور سنے تھے۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہوئی یا شاید بیانکا کو اپنا مدعا صحیح طرح بیان کرنا ہی نہ آیا کہ ایڈون کو اس ساری کہانی میں غلط بیانی نظر آئی۔

اس طرح پہلی ملاقات ناکام رہی تھی۔

جرمنی سے واپسی پر اس کی بیانکا سے دوسری ملاقات ہوئی تھی۔

وہ بکھری ہوئی لڑکی اب کے پورے طمطراق سے آئی تھی۔ جیسے وہ مس ورلڈ ہو اگر نہیں تھی تو کم بھی نہیں تھی۔ ایڈون کو یا سکتے میں آگیا تھا۔

"یہ خوب صورتی مجھے پہلی ملاقات میں کیوں نظر نہ آئی۔" اسے خود پر شبہ ہوا تھا کہ وقت گزرنے اور عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی نظر بھی کمزور ہونے لگی

ہے شاید۔

خود بیانکا کی گفتگو کے ساتھ نظروں کا آنے والا ہر ہر ترکش تھا۔ ان ترکش تیروں کی بھرمار سے ایڈون بھلا کیسے بچتا۔ بیانکا کی سنائی کہانی کے سارے جھول خود بخود ہی ختم ہو گئے۔

ایڈون نے اسے اگلے دن پھر آنے کا کہا تھا۔

وہ سارا دن اس نے گھر میں گزارا تھا۔ اپنی موجودہ اور ماضی کی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے۔ سوائے دولت کی فراوانی کے کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کی بنا پر وہ خود کو کامیاب مرد تصور کر سکتا۔ سنگل ہونے اور رہ جانے کے باعث وہ اب تک ایک ناکام زندگی بسر کرتا آیا تھا۔ ویسے اس بات کا اعلان تو اس کی بہن بھی ہر فون کال پر کرتی تھی لیکن یہ احساس آج خود ایڈون پر بڑی شدت سے غالب آیا تھا۔

"جوڈتھ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

بیانکا سے ہوئی تیسری لمبی ملاقات کے اختتام پر اور بیانکا کے جانے کے بعد اس نے اپنے چہیتے ڈرائیور سے کہا تھا۔

"کیا؟ کس سے۔۔۔ کون ہے وہ سر؟"

"یہ جو ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔۔۔ لیکن پھر بھی یہاں ہی ہے۔۔۔ بیانکا سے۔۔۔"

ایڈون نے بتایا اور جوڈتھ کا دل کیا کہ وہ خوشی سے چلا چلا کر پورا محل سر پر اٹھا لے۔

☆ ☆ ☆

"جوڈتھ! تم کیتھی سے کہو کہ وہ بیانکا کو کال کرے۔۔۔ کہیں وہ بھول ہی نہ گئی ہو کہ اسے آج یہاں آنا ہے۔۔۔ کہیں وہ آج کی ملاقات کو بھی عام ملاقات نہ سمجھ رہی ہو۔" ایڈون آج اس بچے کی مانند تھا جو کسی مذہبی تہوار میں اچھے اور مہنگے کپڑے پہن کر اپنی خوشی میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔

"وہ یہ بات کیسے بھول سکتی ہے سر۔ کوئی بھی لڑکی یہ بات کیسے بھول سکتی ہے۔"

"لیکن میں نے اسے ابھی تک کوئی اشارہ بھی تو نہیں دیا۔"

"لڑکیوں کو اشاروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔۔۔ وہ نظر التفات کو مردوں کی نسبت زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتی ہیں۔"

"جوڈتھ۔۔۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو۔۔۔؟" ایڈون نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو یہ مس بیانکا کی بدقسمتی ہو گی۔"

"اچھا۔۔۔ تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی کہتے ہو گے۔" ایڈون صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

پھر بڑی دیر کے بعد رات میں بیانکا کی آمد کی خوشبو آئی تھی۔

"وہ آ گئی ہیں سر۔۔۔ مس بیانکا۔"

جوڈتھ نے آکر اسے اطلاع دی تھی۔

"اوہ۔۔۔" ایڈون جیسے نیند سے جاگ کر اٹھا تھا۔

"تو تم پھر جاؤ یہاں سے۔۔۔ تمہارے سامنے میں یہ بات بھلا کیسے کروں گا۔"

"ٹھیک ہے سر!" جوڈتھ ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

ایڈون خود کو بڑے ضبط سے اپنے مستقل رعب والے سراپے میں لانے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ لیکن جوں ہی بیانکا اندر داخل ہوئی ایڈون کو یہ ضبط کہیں کھوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"آپ نے کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے مجھے بلایا تھا۔"

بیانکا کا لہجہ ایک کسٹمر جیسا تھا۔ حالانکہ کیتھی نے اسے سارے حالات بڑی وضاحت سے بتا دیے تھے۔ اور وہ جانتی تھی کہ ایڈون نے آج اسے یہاں صرف کسٹمر کی حیثیت سے نہیں بلایا۔

"غفار جلال کے گھر کا پتا چل گیا ہے۔ وہ فلوریڈا میں بنگال یارڈ نامی علاقے میں رہتے ہیں۔۔۔ اب وہ لوگ زراعت کے شعبے سے منسلک نہیں ہیں۔۔۔ انہوں نے اسٹور خریدا ہے بہت بڑے لیول کا اور وہ تینوں اسے ہی رن کر رہے ہیں۔ یہ چیز ان کے خلاف جاتی

ہے کہ انہوں نے محکمہ زراعت سے کس وجہ کے تحت غلط بیانی کی کہ وہ پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں۔۔۔ جبکہ وہ فلوریڈا آباد ہونے کی سوچ رہے تھے دوسرا یہ کہ اتنے بڑے لیول کا اسٹور خریدنے کے لیے ان کے پاس رقم کہاں سے آئی۔"

"انہوں نے ڈیڈ الیاس کی پراپرٹی کو سیل کر دیا تھا جو می ان کے نام کر چکی تھی۔"

"میں نے یونین کے آفس سے ریکارڈ حاصل کر لیا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہو پایا ذراصل تم نے اپنے اثاثے غفار جلال یا احمد کے نام منتقل نہیں کیے تھے۔ بلکہ کسی انجان آدمی کو بیچے تھے دستاویزات میں اس آدمی کا نام مائیکل ہے۔ مائیکل غفار کا دوست تھا اور اسے فوت ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔" بیانکا کو شاک لگا تھا' مکار لوگوں نے کس طریقے سے ساری کارروائی کی تھی۔

"یہ وہ واحد چیز ہے جو ان کے خلاف سب سے بڑا ثبوت بن سکتی ہے۔ نہ جانے انہوں نے یہ حرکت کیوں کی؟ شاید سارے معاملے سے خود کو دور رکھنے کے لیے' لیکن مائیکل کی موت کا راز کھل جانے کے بعد اب وہ اس میں بری طرح پھنس جائیں گے' غفار مائیکل نامی شخص کو نہیں جانتا۔ اس کے لیے یہ بات ثابت کرنا مشکل ترین بلکہ ناممکن ہے۔۔۔ جبکہ یونین کے آفس میں نصب کیمروں سے یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ تم ان تینوں کے ساتھ ہی آفس میں آئی تھیں۔۔۔ تمہارا اٹارنی بھی ساری سازش میں شامل رہا ہے۔ وہ بھی بچ نہیں سکے گا۔ مزید شواہد اکٹھے کرنے کے لیے ہمیں دولت کا سہارا لینا پڑے گا۔ دولت کی طاقت تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکی ہو۔۔۔ جو انسان اچھے ہوتے ہیں صرف موقع کے فقدان کی وجہ سے اچھے ہوتے ہیں جیسے ہی انہیں برائی کرنے کا موقع ملتا ہے' وہ بڑے انسانوں کو بھی مات دے جاتے ہیں۔"

ایڈون نے کہا تو بیانکا نے سر کی جنبش سے ساری بات کا جواب دیا تھا۔ وقتی طور پر وہ افسردہ ہو گئی تھی۔ یہ وہ قصہ تھا جو جب بھی سنایا جاتا تھا اسے لہولہان کر جاتا تھا۔

"میں تم سے ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں بیانکا۔۔۔ درحقیقت میں نے آج تمہیں اس لیے بلایا ہے۔" جذبات سے عاری لہجے میں فقرہ ادا ہوا تھا۔

"آپ کہیں میں سن رہی ہوں۔" اس نے حیفہ مام کی بات حیفہ مام کے لہجے میں ہی ادا کی تھی۔

تھوڑی دیر ایڈون خاموش بیٹھا رہا تھا۔ پھر اٹھ کر کارنس کی طرف گیا تھا۔ جہاں کرسٹل ویز کے ساتھ مخملی ڈبیہ رکھی گئی تھی۔ بیانکا کے لیے اس ساری صورت حال کا کوئی پہلو بھی نیا نہیں تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی بیانکا؟"

یک لخت پلٹ کر اور کھلی ڈبیہ میں جگمگاتی انگوٹھی بیانکا کی طرف بڑھا کر ایڈون نے پوچھا تھا۔

"تم اگر مجھ سے شادی کر لو تو یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو گی۔" بیانکا کے لیے سب غیر متوقع تو نہیں تھا جس رات وہ اپنے حسن کے جام میں موجود شہد اور زہر کے عنصر سے واقف ہوئی تھی اس رات ہی اس نے بڑے گہرے فیصلے کر لیے تھے۔ اس کا پہلا ہی ہدف ایڈون تھا۔ وہ کامیاب ہوئی تھی۔ اس نے ایسا ہی سوچا تھا۔۔۔ جیسا اب ہو رہا تھا۔۔۔ پھر بھی اس کے چہرے پر سوچی سمجھی مسکراہٹ نہ آ سکی تھی۔

کمرے سے باہر دیوار کے ساتھ جڑ کر کھڑے جوڈتھ اور کیتھی سمیت دوسری میڈز کو ایڈون سے بھی زیادہ اس سوال کے جواب کا انتظار تھا۔ سب کے چہرے انجانی خوشی سے دمک رہے تھے۔

بیانکا نے ایک نظر۔۔۔ تراشے گئے ہیرے کو دیکھا تھا۔

اس ہیرے کی چمک ایسی تھی جیسی تہ خانے کے اندھیرے میں چمکتے حیفہ مومر کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کی۔۔۔ اس ہیرے کی چمک ایسی تھی جیسی کول بوزن سے آتی سورج کی ترچھی اور پھر ترچھی ہوتی بنفشی شعاعوں کی۔

بیانکا نے بہت ساری روشنیاں اکٹھی کرنی تھیں

اور پھر اپنے آگے کے راستوں کو تلاش کرتا تھا۔ اس ہیرے کی چمک کم از کم اتنی تو ضرور تھی کہ اب وہ اندھیروں سے ڈر نہیں سکتی تھی۔ ڈیڈ الیاس کی گردن پر ثبت سرخ لکیر کے مضبوط تصور کو بھول سکتی تھی۔

"بولو بیانکا۔۔۔ میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔"

"ہاں۔۔۔!" آنکھوں کو۔۔۔ پلکوں کو۔۔۔ کافی دیر سے ساکت رکھے اور بنا چہرے کو ہلائے وہ نجانے کس رخ سے بولی تھی۔

ایڈون کو کو اسی بات کی توقع تھی پھر بھی اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئی تھیں۔ انگوٹھی نکال کر اس نے بیانکا کو پہنا دی تھی۔ جسے پہن کر وہ ایک طرح سے آدھی کامیاب ہو گئی تھی۔

اس کی خاموشی اور اداسی کے اسبابوں کی وجہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہی تھی کیا وہ یہ ہی سب نہ چاہتی تھی۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔"

چند منٹ کی مزید گفتگو کے بعد بیانکا نے کہا تھا اور ایڈون کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اٹھی تھی۔

باہر نکلنے سے پہلے اس نے بڑی احتیاط سے رنگ کو اپنی انگلی سے اتار کر ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا۔۔۔ لیکن لمبی روش کو پار کرتے وقت اس نے دوبارہ ہینڈ بیگ کھول کر رنگ کو واپس پہن لیا تھا۔

"یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے کسی صورت راز میں رکھنے کی ضرورت ہے۔۔۔ خصوصاً "شہرام سے۔"

ٹیکسی میں شہرام بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ اس لیے اس نے وہاں تک پہنچنے سے پہلے اپنے چہرے پر بہتے بے تحاشا آنسوؤں کو بڑی نفاست سے صاف کر لیا تھا۔



"اپنے کیریئر کا آخری ٹریک میں تمہارے نام کرتی ہوں۔۔۔ مارٹا۔"

ہیڈ فون کو کانوں سے لگا کر بیانکا نے کہا تھا۔ جواب میں مارٹا دل سے مسکرائی تھی۔ پھر چند ہی لمحوں بعد بیانکا نے چار گانوں کی جنگل بیٹ شروع کی تھی۔

"بالآخر وہ دن آنے ہی والا ہے جب میں پہلی بار سکون سے سوؤں گی۔" وہ Delay (ایک ایفکٹ) کا استعمال کرنے لگی تھی۔

جب وہ لوگ جیلوں میں سڑیں گے تو کیا کیا جانتیں نہ ہو جائیں گی ان سب کی۔۔۔ تب وہ لوگ جان جائیں گے کہ قید کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ تب وہ اس جائیداد کو بھی ترسیں گے جو پہلے سے ہی ان کے پاس تھی اور جس پر وہ خوش نہ رہ سکے۔ وہ مجھ سے معافی مانگیں گے ہلیکن میں انہیں ہرگز معاف نہ کروں گی۔۔۔ کیا انہیں معاف کرنے کے لیے میں نے اتنی مشکلوں کا سامنا کیا ہے۔ یہ اذیت انہیں جھیلنی ہو گی۔۔۔ وہ خدا سے معافی مانگیں گے گڑگڑائیں گے۔۔۔ خدا چاہے گا تو انہیں معاف کر دے گا۔ لیکن کوئی ایسا معجزہ نہیں ہو گا جو ان لوگوں کو سزاؤں سے بچا سکے۔۔۔ کس قدر خوب صورت منظر ہو گا وہ جس دن میں ان سب کو سلاخوں کے پیچھے دیکھوں گی۔۔۔ کسوف گرفتگی آفتاب سے بھی گہرا منظر۔۔۔ میں روز جاؤں گی ان سے ملنے۔۔۔ یہ دنیا کا خوب صورت ترین نظارہ ہو گا اور میں اس سے روز فیض یاب ہوا کروں گی۔۔۔ اپنے دل کو روز تسکین دیا کروں گی۔۔۔ جیسے روز میں نے خود کو یہاں اذیت دی ہے۔ اتنی کہ اذیت میری ذات کا حصہ بن گئی ہے۔۔۔ لیکن اب اس خود اذیتی کے دن پورے ہو گئے۔ اب میری باری آ گئی۔۔۔ کھیل کے دوسرے حصے کی۔۔۔ جس میں سارے مہرے بھی میرے ہوں گے اور ساری چالیں بھی میری ہوں گی۔۔۔

گانے کے بول۔

خود کو جان لو۔۔۔ پہچان لو
تم فاتح ہو جاؤ گے

"ہاہا۔۔۔ ہاں میں نے خود کو جان لیا۔۔۔ اور اب میں فاتح ہوں۔۔۔ اس فتح کے لیے خود سے جنگ کرنا بڑا مشکل تھا۔

ہمارا انجان رہنا ہمارے لیے نقصان کا باعث تھا اور مجھے خدا پر کامل یقین تھا کہ کامیابی آخر میری ہی ہو گی۔

دلدل میں دفن ہونے سے بہتر ہے کہ
سفر ختم کر دیا جائے

وہ لی اور ڈی کے بٹنوں کو اوپر نیچے کرنے لگی تھی۔

"وہ آگیا ہے۔"

مارٹا نے اس کے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کی تھی۔

"کون؟"

"تمہارا دوست۔۔۔ شہرام۔"

"کہاں ہے۔"

"وہاں۔۔۔ نیچے وہ دیکھو۔"

مارٹا نے اشارہ کیا تو بیانکا نے اسی سمت دیکھا تھا۔ وہاں شہرام کھڑا اوپر بیانکا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ بیانکا نے اپنی پوری جان لگا کر اسے ہائے کیا تھا۔ شہرام اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن وہ مسکرا نہ سکا تھا۔

جب ہم مایوس نہ ہونے کا ارادہ کرتے ہیں
اور پا لیتے ہیں بالآخر جو چاہتے ہیں

میوزک کا ردھم ہلکا ہوا تھا۔ بیانکا مزید کوئی ایفکٹ استعمال نہیں کر سکی تھی۔ اسے شہرام کا اس طرح سنجیدہ رہنا عجیب لگا تھا۔ ایڈون سے شادی والی بات کے بعد سے وہ اسے آج نظر آیا تھا۔ پورے ایک ہفتے کے بعد۔۔۔ وہ شاید ان دنوں اس قدر مصروف رہا تھا کہ نہ ہی بیانکا سے مل سکا تھا اور نہ ہی اس کی کال کا جواب دے سکا تھا۔

پھر بھی ہم ادھورے سے کیوں رہ جاتے ہیں۔

بیٹ جنگلنگ کم ہوتے ہوتے کنارے سے لگنے لگی تھی۔ بیانکا نے ہیڈ فون اتار کر اسٹینڈ پر رکھا تھا۔

"الوداع پیاری مارٹا۔۔۔ تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔"

وہ تیزی سے سیڑھیاں اُتر جانا چاہتی تھی۔

"سنو بیانکا۔۔۔!" مارٹا نے پکارا تو بیانکا واپس پلٹی تھی۔

"ٹیرس پر آج تمہارا آخری دن تھا۔۔۔ یہ سوچ کر اداس ہو یا کوئی اور وجہ ہے۔"

بیانکا کا دل سوکھے پتے کی طرح کلپا تھا۔ جیسے اس کی کوئی چوری واقعی میں پکڑی جا چکی ہو۔

"کیا کہہ رہی ہو مارٹا؟"

"وہی جو تمہارے چہرے۔۔۔ تمہاری چال سے عیاں ہے۔"

"جاب پر آخری دن ہے۔۔۔ شاید اسی وجہ سے۔"

وہ خود بے یقینی سے بولی تھی۔

"چند دنوں میں تمہاری شادی ہونے والی ہے۔۔۔ شادی کی خوشی کبھی کبھی اداسی سے زیادہ ہوتی ہے۔"

بیانکا نے اپنی جھکی پلکیں اٹھا کر مارٹا کو دیکھا تھا۔

"ٹھیک کہتی ہو۔" اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے آ گئی تھی۔

بڑی دیر تک نظریں دوڑانے کے بعد بھی شہرام اسے وہاں کھڑا نظر نہیں آیا تھا جہاں وہ آ کر کھڑا ہوا تھا۔

"وہ واپس جا چکے ہیں۔"

ویٹر نے اسے کھوجتی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے دیکھ کر کہا تھا۔

"کب۔۔۔؟"

"چند لمحوں پہلے"

"لیکن وہ چند لمحوں پہلے ہی تو آیا تھا۔"

یہ فقرہ اس نے ویٹر سے زیادہ خود سے کہا تھا۔ پھر وہ تیزی سے داخلی دروازے کی طرف بھاگی تھی۔ لیکن دروازہ پار کرنے سے پہلے ہی اس کی چال سست ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اتنے سے وقت میں کہاں گیا ہو گا لیکن اب وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اذیت بھی تو دینا نہ چاہتی تھی۔

"کیونکہ بعض اوقات چیزیں کھو دینے کا فن اچھا ہوتا ہے۔" اسے بہت پہلے کی پڑھی ہوئی ایک نظم یاد آئی تھی۔

"جب چیزیں ہماری دسترس میں آتی ہیں اور ہم سے دوبارہ کھو جاتی ہیں تو پھر ہمیں یہ بات مان لینی چاہیے کہ وہ چیزیں ہمارے لیے نہیں ہیں یا ہم ان کے لیے نہیں بنے۔"

اسے ڈیڈ الیاس کی ایک بات یاد آگئی تھی۔

"تم جیسی لڑکی تم اتنی خود غرض کیسے ہو گئیں؟"

وہ داخلی دروازے سے واپس آ رہی تھی جب مارٹا

نے نیا ٹریک شروع کیا تھا۔ اس ٹریک میں اسے اپنے لیے ایک طنز کا تیر کمان میں اٹکا ہوا نظر آیا تھا۔ چلتے چلتے اس نے دنیا کے ان تمام شاعروں پر لعنت بھیجی تھی جو ایسی بے معنی شاعری کرتے ہیں۔

"اچھی لڑکی تم اتنی خود غرض کیسے ہو گئیں۔"

آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی تھی۔ وہ ان الفاظ کو سننا نہیں چاہتی تھی پھر بھی ٹریک کی آواز نے ڈریسنگ روم تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مصنوعی جھیل کے باسی پانی کی لہریں سنہری تھیں۔ شہرام کو اندازہ نہیں تھا کہ سنہری رنگ کبھی اتنا ظالم بھی ہوا ہے۔

Edwan with Bianca

انویٹیشن کارڈ کے باقی مندرج اس سے پڑھے نہیں جاتے تھے۔ وہ ان دو لفظوں کے مہاجال سے باہر ہی نہیں نکل پا رہا تھا۔

بیانکا کی نظریں بظاہر جھکی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ ترچھی نظروں سے شہرام کے تاثرات جاننے کی ہی کوشش کر رہی تھی۔

"تم نے ایڈون سے شادی کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا ہے تاکہ وہ تمہارا مقدمہ لڑے۔" وہ جو بڑی دیر سے خاموش تھا۔ اب بولنے پر آیا تو بالکل ہی براہ راست ہو گیا۔

"میرے فیصلے میں یہ وجہ سب سے اول تھی۔" بیانکا نے صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔

"میرے خیال میں۔۔۔ مجھے لگتا ہے بیانکا کہ یہ مس میچ ہے۔۔۔ عمروں کا فرق اور۔"

"میرے ساتھ جو کچھ ہوا اس سب کا بھی میری عمر کے ساتھ مس میچ ہی تھا۔" بیانکا کے لہجے میں دبا ہوا غم اور غصہ تھا۔

"لیکن۔۔۔ اس طرح۔"

"دنیا ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے شہرام۔۔۔ کیا تم نے یہ ساری باتیں کرنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے؟"

"نہیں۔۔۔" شہرام اداس ہو گیا تھا۔ "جوبات کرنے کے لیے بلایا تھا وہ تو میں کہہ ہی نہیں پا رہا۔" بیانکا اپنی انگلیوں کے ناخنوں میں کھو گئی تھی۔

"کیا تمہیں دولت عزیز ہے بیانکا؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن میں اپنے ڈیڈ کے بنائے اثاثوں کو کسی اور کے پاس نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ میں ان تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہوں۔" بیانکا جذباتی ہونے لگی تھی۔

"خدا بننے کی کوشش مت کرو بیانکا۔۔۔ یہ اختیار اللہ کے پاس ہے۔۔۔ اس کے پاس ہی رہنے دو۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو شہرام!" بیانکا ہنسی تھی۔ شہرام اس کی ہنسی میں چھپے طنز کو جان گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ کیوں کہ بابا نے ٹھیک کہا تھا کہ وقت آنے پر ہم اپنی ایسی سوچوں پر ضرور پچھتاتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔۔۔ یہ موقع مجھے اللہ نے ہی دیا ہو شہرام۔"

بیانکا کو اپنی استہزائیہ ہنسی پر ندامت محسوس ہوئی تھی۔

"جب سیرین نے مجھے چھوڑا مجھے لگا کہ میں اب کبھی بھی کسی سے بھی محبت نہیں کر سکوں گا۔ مجھ میں محبت کرنے کی قابلیت 'ہنر سب ختم ہو گیا ہے' لیکن ۔۔۔ لیکن پھر میں تم سے ملا اور میں نے جانا کہ اپنے دل کی لگامیں ہم کبھی بھی اپنے ہاتھوں میں نہیں تھام سکتے۔"

بیانکا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے پیروں کے نیچے خشک تنکوں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر کرنے لگی تھی۔ اس حالت میں بیٹھی ہوئی وہ شہرام کو سیرین کی طرح دکھائی دے رہی تھی 'جو ارجیر کی پہاڑی پر کدام کے درخت کے نیچے ایک ٹیلے پر ایسے ہی بیٹھی اپنی بے وفائی کی آدھی ادھوری وجہ بیان کر رہی تھی۔

"ایک بات کہوں بیانکا۔"

"کہو شہرام۔۔۔ کب سے تم ہی تو کہہ رہے ہو اور میں صرف جواب دے رہی ہوں۔"

"تو پھر اس آخری بات کا بھی جواب دے دو۔"

"میں سن رہی ہوں۔"

"مجھے۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے بیانکا۔"

شہرام نے کہہ دیا جیسے اس نے سیرین سے کہہ دیا تھا کہ اس کے بغیر وہ مر جائے گا' حالانکہ آج کی ہی طرح تب بھی اسے اندازہ تھا کہ سیرین کو اب وہ کبھی نہیں پا سکے گا۔

"اتنی محبت کہ اتنی محبت تو شاید تم۔۔۔ تمہیں خود بھی خود سے نہ ہو گی۔"

"ان باتوں کا اب کیا فائدہ شہرام۔۔۔ پندرہ دنوں کے بعد ویسے بھی میری شادی ہے۔۔۔ اپنی کامیابی کے اتنے قریب پہنچ کر میں واپس نہیں پلٹ سکتی شہرام۔۔۔ تم میرے اچھے دوست ہو۔۔۔ ہمیشہ رہو گے۔۔۔ دوستی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق یا دونوں محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور اچھے دوست ایسے مسئلوں کو پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بہت خوش اسلوبی سے حل کر لیتے ہیں۔"

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں بیانکا؟"

شہرام نے اسے درمیان میں ہی ٹوکا تھا۔ وہ لا حاصل گفتگو کر رہی تھی۔ بیانکا خاموش ہو گئی۔

"میرے مشاہدے کو اتنا بے مول تو نہ کرو۔"

شہرام نے کہا تو بیانکا اپنی جگہ پر سن سی ہو گئی "تو کیا یہ سب جانتا ہے؟" وہ سوچنے لگی۔

"ہے۔۔۔ لیکن ایک دوست کی حیثیت سے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"میرا سچ بولنا بھی اب بے کار ہے۔"

"تمہارے پاس ابھی بھی وقت ہے۔"

"مجھے ہر صورت ان لوگوں سے بدلہ لینا ہے۔۔۔ فی الحال میں اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں سوچ سکتی اور نہ ہی سوچنا چاہتی ہوں۔"

وہ سیرین کی طرح باغیانہ انداز سے بولی تھی۔

"کیا تم اپنے بدلے کو اللہ کے حوالے نہیں کر سکتیں۔۔۔ وہ ہر صورت بہتر حالات بنا لیتا ہے۔"

"اور تب تک میں کیسے زندہ رہوں۔۔۔ بولو۔۔۔ مجھے سانس کیسے آئے گی۔"

"اگر تم سب اللہ کے حوالے کر دو گی تو وہ تمہیں صبر دے گا۔"

"تمہارے لیے کتنا آسان ہے شہرام۔۔۔ تم اس فیز سے آگے بڑھ آئے ہو تم کیسے جانو گے! جب میں نے پہلی بار ٹی وی پر احمد کو دیکھا تھا تو میری کیا حالت ہوئی تھی۔۔۔ اگر میں کسی طرح اس کا گلا دبا سکتی تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی تھی۔۔۔ اور کوئی سزا مجھے ڈرا نہیں سکتی تھی۔

تم میری ان فیلنگز کو کیسے جانو گے شہرام جب میں ڈیڈ کے اثاثوں پر کسی اور کو قابض دیکھتی ہوں۔۔۔ ایک ایک چیز ڈیڈ اور ماما نے کس قدر لگن اور محنت سے بنائی ہے تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔۔۔ اور تم ان ساری باتوں کو کبابوں کے جل جانے سے نسبت دے رہے ہو۔"

بیانکا روانی میں بولتی چلی گئی تھی۔ اس کی آواز قدرے تیز ہو گئی تھی۔ اور آخری بات کہہ چکنے کے بعد اسے گہرا افسوس ہوا تھا۔ شہرام کے چہرے پر تاریک رنگ آکر ٹھہر گئے تھے۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا شہرام۔۔۔ میرا مقصد تمہیں دکھ پہنچانا نہیں تھا میں تمہاری محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں۔۔۔ لیکن میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔"

شام میں پرندوں کے غول اپنے اپنے بسیروں کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ نجانے ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی نوعیت متغیر تھی یا پروازوں میں فریب' مشابہت حد سے بڑھ گئی تھی کہ بدیسی اور دیسی پرندوں میں فرق کرنا ستاروں کی روشنی اور غم کی طرح مشکل ترین ہو گیا۔

اس منظر پر ٹکٹکی باندھے شہرام کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"وقت آگیا ہے ہجرت کر کے آئے ہوئے پرندوں کے واپس لوٹ جانے کا۔" اس نے خود سے کہا تھا۔

"ماما جا! آپ کی ساری دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔۔۔ آپ کا بیٹا واپس آرہا ہے۔۔۔ اگرچہ جس حالت میں گیا

تھا اس سے بھی بدتر حالت میں۔"

مغرب کے زعم میں ڈوبے دن کے کنارے کی طرف پرواز کرتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے شہرام نے کہا تھا۔ یہ پرندے یقیناً "اس کا پیغام اہل زنجو یہ تک لے جانے والے تھے۔



تاروں سے سجی رات میں Fuchsia کی بیل بھی اپنے چنچل رنگ کھو چکی تھی۔ بیانکا نے کھڑکی کی زیریں سرے پر اپنے دونوں ہاتھ ٹکائے تھے۔

فانوسی پھول رات کی کرم نوازی کے باعث بند ہوئے پڑے تھے۔ نجانے کس کس پھول میں شہد کی کون کون سی مکھی بند تھی۔ مرنے کے بالکل قریب۔۔۔ یا مرچکی۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

قدرت کے نظام میں ان گنت سوالیہ نشان کیوں ہیں۔ قدرت کے نظام میں اتنے ہی جواب کیوں نہیں ہیں۔

"دعا کرو۔ دیر سے ہی سہی ' وہ آج گھر واپس آجائے۔" اسے حیفہ مام کا رندھا ہوا لہجہ اور بھیگا ہوا چہرہ یاد آیا تھا۔

"خیریت؟۔۔۔ اس کے لیے ہی تو دعا کر رہی ہوں۔"

"میرے دل کے خوف خدا کرے بس یہ پورے نہ ہوں۔"

"میں اپنی دعاؤں کو اور وقت کو تھوڑی مزید مہلت دینا چاہتی ہوں۔"

"ہم تو بس دعا ہی کرسکتے ہیں۔ تم دونوں جلدی یہاں پہنچو۔"

پھر اس کے تصور میں چچا جلال کی آواز کی بازگشت دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔

"دروازہ کھولیے۔"

"یہ دروازہ اتنے آرام سے نہیں کھلے گا۔"

"اب یہاں بیٹھ کر تسلی سے سوچو کہ تمہیں دستخط کرنے ہیں کہ نہیں۔"

"حرام زادی کرو دستخط۔"

"الیاس کے دائیں طرف حیفہ کی قبر ہے۔"

اس کی خود کی اپنی زندگی میں بھی اس رات کے تاروں کی طرح ان گنت سوال تھے۔ ایسا کیوں ہوا۔۔۔ میرے ساتھ ہی کیوں۔۔۔ کسی ایک کا بھی جواب نہیں تھا' صرف بے چینی تھی۔ اضطراب تھا۔

"اور تم چاہتے ہو شہرام! کہ میں ان سب کے بدلے میں تم کو فوقیت دوں۔۔۔ اپنے دل کی سنوں۔۔۔ دماغ کی نہیں۔۔۔ میں دل کی سن لوں اگر میری یادداشت کہیں گم ہوجائے۔۔۔ میں تمہاری بات مان لوں۔۔۔ سب کچھ خدا پر چھوڑ کر صبر کرلوں اگر حالات رفتہ رفتہ میری سماعت مجھ سے نہ چھین رہے ہوں تو؟" کھڑکی بند کرکے وہ واپس پلٹی تھی۔

بیڈ پر مختلف برانڈز کی مہنگی ترین چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے سیل فون اٹھا کر شہرام کو کال کی تھی۔ حسب معمول اس کا سیل فون آف تھا۔

"ٹھیک ہے شہرام۔۔۔ تمہارا ناراض ہونے کا پورا حق بنتا ہے۔۔۔ میں دوستی کے ناتے تم سے تمہارا یہ حق نہیں چھینوں گی۔"

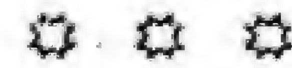
سیل فون اس نے واپس بیڈ پر اچھال دیا تھا اور ایڈون کی طرف سے بھیجی جانے والی اشیاء میں سے سفید برائیڈل گاؤن کو اسٹریپس سے پکڑ کر دیکھا تھا ڈریس بلاشک و شبہ بے انتہا خوب صورت تھا۔

کیٹی نے اسے پہلے ہی بتادیا تھا کہ جو ڈتھ اس کے لیے کس قدر مہنگی مہنگی اور جاذب نظر اشیا اکٹھی کررہا ہے۔

"تم خوش قسمت ہو بیانکا۔" کیٹی نے آخری فقرہ چلاتے ہوئے کہا تھا۔

اور اب وہ بیڈ پر بکھری ہوئی چیزوں کو تاسف سے دیکھ رہی تھی۔

ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں تھی جو اس کو دلی خوشی ہی دے سکتی۔



دو موسموں کے سنگم کا وہ غلاملا اپنے وسط میں تھا فریبی موسم کی کرنیں جابجا پھیلی ہوئی تھیں۔۔۔ مایوسی' یاسیت' اداسی اور خودکشی کرلینے والے موسم کی کرنیں۔۔۔ فضا میں کف دریا کی آمیزش تھی اور دن کی روشنی میں بے نوری کا ماتم۔

بیانکا نے نظریں اٹھا کر آئینے میں خود کو دیکھا تھا اور خود سے بھی زیادہ کسی تیسری چیز کو۔

برائیڈل گاؤن ہیروں سے دمکتے زیورات اور گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک۔

"دیکھیے مام ڈیئر۔۔۔ آپ دونوں کی روحوں کو ایصال ثواب پہنچانے کا میں نے پورا پورا انتظام کرلیا ہے۔" اس کی قدرتی کاجل لگی آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔

"اور یہ کیسی شادی ہے کہ جس میں میرا اپنا کوئی بھی نہیں۔۔۔ اور خود میں بھی آج اپنی نہیں۔" وہ نڈھال سی ہوکر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"شہرام! صرف ایک تم ہی تو میرے اپنے تھے۔۔۔ اور تمہیں بھی آج ہی ناراضی نبھانے کا خیال آیا۔"

اس تباہ کن روپ کے ساتھ وہ افسردہ ہو رہی تھی ماہر بیوٹیشن نے اس کے تراشے ہوئے سراپے کو مزید نکھار دے دیا تھا۔

"بیانکا!" کیٹی دروازے میں کھڑے کھڑے ہی چلائی تھی۔ بیانکا نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا اس کے تصورات کی دنیا گنڈ ہوگئی تھی۔

"لوگ آگئے ہیں۔۔۔ تم تیار رہنا۔۔۔ جلد ہی تمہیں بھی بلالیا جائے گا۔" کیٹی خوشی سے کہتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔

بیانکا نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو ایک دم سے بڑھتا ہوا پایا تھا۔

"مس بیانکا۔۔۔ یہ آپ کے لیے آئے ہیں۔"

میڈ نے اسے پھولوں کا ایک گلدستہ پکڑایا تھا۔ بیانکا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گلدستہ تھام لیا تھا۔ میڈ نے نوٹ رجسٹر بیانکا کے آگے کیا تھا۔ سینڈر نیم (بھیجنے والے کا نام) شہرام تھا جس کے آگے اس نے "ہیئرز فرینڈ" لکھ دیا تھا میڈ رجسٹر لے کر باہر چلی گئی تو وہ تفصیل اور محبت سے گلدستے کو دیکھنے لگی۔

ہری بنا کئی ڈنڈیوں کے اوپر لگے سرخ گلاب اور پیلے لالے کے پھولوں کا گلدستہ۔۔۔ جیسے دنیا کے سارے حسین منظروں کی عکاسی کررہا تھا۔

گلاب اور لالہ۔۔۔ محبوب اور رقیب۔

نجانے شہرام اس استعارے میں چھپ کر مجھے کیا کہنا چاہتا ہے۔

گلدستے کے اندر ایک خط بھی موجود تھا۔ بیانکا نے خط کو باہر نکال لیا۔ بند کاغذوں میں چھپی تحریریں اسے ویسے بھی بہت خوف زدہ کردیتی تھیں ایک بار پہلے بھی اسی طرح کے بند کاغذ کے کھلنے نے اس کی دنیا ویران کردی تھی۔

"خدا کرے تم خیریت سے ہو شہرام۔"

نجانے کیوں بیانکا کا دل گھبرانے لگا۔ خط چاک کرتے وقت یہ دعا خود بخود ہی اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ تب ہی کاغذ کی تحریر کے ساتھ وہ تعویذ بھی برآمد ہوا تھا جسے شہرام ہر وقت اپنے گلے میں پہنے رکھتا تھا اور جس نے بیانکا کو پہلی ہی بار میں بڑی حیا تک پریشانی سے دوچار کردیا تھا۔

"بیانکا۔۔۔! تم سے محبت کرنے کے بعد خود سے محبت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اپنے ساتھ کیا ہوا عہد توڑ دیا ہے تو میں خود بھی ٹوٹ گیا ہوں اور تم تو جانتی ہو کہ جب جب وعدے یا عہد ٹوٹتے ہیں تو کسی ایک فریق کا دہرا نقصان ہوتا ہے۔ میں یہ نقصان برداشت کررہا ہوں۔ میں واپس جارہا ہوں۔۔۔ البانیہ۔

ہوسکے تو میرے تعویذ کو میری نشانی سمجھ کر پہن لینا ورنہ دل نہ مانے تو پھینک دینا۔ میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ اب یہ میری محبت کے پاس ہے۔

شہرام"

"بیانکا! جلدی آؤ۔۔۔ اب صرف تمہارا ہی انتظار کیا جارہا ہے۔" یہ کیٹی کی آواز تھی۔

"تو میرا خوف سچ نکلا۔۔۔ بند کاغذوں کی تحریریں واقعی میری دنیا ویران کردیتی ہیں۔"

"آئیے مس بیانکا۔۔۔ مجھے آپ کا لباس درست کرنا ہے۔" بیوٹیشن نے اسے بلایا تو اس نے اپنا چہرہ لوپر

اٹھالیا تھا۔

"مس بیانکا آپ رو رہی ہیں۔"

"اوہ گاڈ بیانکا۔ خدا کے لیے اتنے پیارے میک اپ کا ایسا حشر تو نہ کرو یار۔ یہ ماتم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ باہر ایک عالم تمہارا منتظر ہے۔ میڈیا والے بھی آچکے ہیں۔"

"میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں۔"

"بس جلدی آجاؤ اب تم بیانکا۔"

کیتھی بھی باہر نکل گئی تو وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

"میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ یہ میری محبت کے پاس ہے۔"

"تم سے محبت کرنے کے بعد میں خود سے محبت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

"میں واپس جارہا ہوں۔ البانیہ۔"

بیانکا نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے تھے اور اپنی آواز کو کہیں روپوش کرلینا چاہا تھا۔

"شہرام! تمہیں اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے آج کا دن ہی ملا تھا۔ کیا اب تم مجھے کبھی نہ مل پاؤ گے۔"

پہلے وہ یہ سوچ رہی تھی کہ شہرام اس سے ناراض ہے۔ لیکن اب اس پر یہ احساس بری طرح غالب آگیا کہ وہ اسے کھو رہی ہے۔

اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تھا اور اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایڈون کو کچھ زیادہ ہی فیس ادا کرنے جارہی ہے۔

"یہ لیں مس بیانکا!" میڈ نے اس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا تھا اس نے گلاس نہیں پکڑا تھا۔ وہ ایک دم سے اٹھی تھی اور باہر کی طرف چلنے لگی تھی ہر بات سے قطع نظر کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس وقت اس کے ذہن میں شہرام سے ملنے کی سوچ کے علاوہ اور کوئی سوچ نہیں تھی۔

"مس بیانکا کہاں جارہی ہیں آپ۔ آپ نے ایسے نہیں جانا۔ یہ پھول۔ یہ پھول پکڑ کر جانا ہوگا آپ کو۔"

اس نے اپنے پیچھے بیوٹیشن کو چلاتے ہوئے سنا تھا۔

وہ ہال کی طرف نہیں جارہی تھی۔ بلکہ عقبی دروازے سے باہر کی طرف نکل رہی تھی۔

"مس بیانکا!" ایک بار پھر چلا کر اسے پکارا گیا تھا۔ اس کے قدم مزید تیز ہوگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

السائی ہوئی دھوپ میں خوابیدہ انگڑائی کا خمار تھا۔ تاجدار سورج اپنی تمام تر تابانی سمیت "حب" کے سارے عکس نکلے نصف النہار کے زاویے سے آگے کی اور سرک چکا تھا جب وہ ہال سے باہر نکلی۔

"مس بیانکا!" جوڈتھ نے حیرت سے بیانکا کو دیکھا تھا وہ مزید آنے والے مہمانوں کو ریسیو کر رہا تھا اور اب خود بھی ہال کے اندر ہی جارہا تھا۔

"مجھے کہیں جانا ہے جوڈتھ۔ بہت ضروری۔ ابھی اسی وقت۔"

"لیکن مس بیانکا۔"

"لیکن نہیں جوڈتھ۔ میرے پاس وضاحت دینے کا وقت نہیں ہے۔ پلیز تم جلدی کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ ٹھہریئے میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔"

جوڈتھ کہہ کر گیا تھا اور پھر چند لمحوں بعد ہی واپس آگیا تھا۔ بیانکا وائٹ لیموزین میں اپنے برائیڈل گاؤن کے ساتھ اندر بیٹھ گئی تھی۔ جہاں ہر سو ایڈون کی خوشبو چھائی ہوئی تھی۔

اندر بیٹھتے ساتھ ہی اس نے جوڈتھ کو اوک بلڈنگ کا پتا سمجھایا تھا۔ لیکن ابھی گاڑی نے اسپیڈ ہی پکڑی تھی کہ وہ جیسے چونکی۔

"نہیں۔ پہلے سنٹرل پارک چلو۔ وہ وہاں نہ ہو۔"

جوڈتھ نے بیک ویو مرر سے بیانکا کو عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ بیانکا نے جوڈتھ کے اس طرح دیکھنے کو بڑی خود غرضی سے نظرانداز کردیا تھا۔

گاڑی سنٹرل پارک کے مین گیٹ پر رکی تو وہ جوڈتھ کے کچھ کہنے سے پہلے خود ہی باہر نکلی تھی اور پارک کے ان گوشوں میں گئی تھی۔ جہاں وہ اور شہرام اکثر و بیشتر بیٹھا کرتے تھے۔ جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور جہاں آخری بھی۔ وہ یہاں نہیں تھا۔

وہ اس چیز کو بھی خاطر میں نہ لائی کہ لوگ اس کو اس سراپے میں ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے کیسی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

"فالی ریسٹورنٹ چلو۔ وال اسٹریٹ۔ ایتھر یارڈ۔"

گاڑی میں دوبارہ بیٹھ کر اس نے کہا تھا۔ جوڈتھ نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی بلکہ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے مس بیانکا۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا۔ فالی ریسٹورنٹ چلو۔ تم میرے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے' ورنہ میں ابھی گاڑی سے نیچے اتر جاؤں گی۔"

اس نے دھمکی دی تھی۔ جو کام کر گئی تھی۔ جوڈتھ نے گاڑی اسٹارٹ کرکے موڑی تھی۔ ریسٹورنٹ بند تھا۔ یہ دن کا وقت تھا اور بار ہی کیو آٹھم رات کے لیے مختص تھے۔ بیانکا مایوس ہوگئی تھی۔

"اوکس بلڈنگ۔"

اس نے پھر تیزی سے کہا جوڈتھ نے سر جھٹک کر حکم پر عمل درآمد کیا تھا۔

اوک بلڈنگ کے آگے کی سڑک پگھلی ہوئی برف کی نمی کے باعث کچھ مزید کالی دکھتی تھی' درمیانی ہیل والے اس کے سنگ جراحت کے سے سفید جوتوں جن میں نقرئی پن کی جھلک تھی نے سڑک سے برف اور برف سے Oak بلڈنگ کے دروازے تک کی سیڑھیوں کا فاصلہ بڑی عجلت میں طے کیا تھا۔ اس کے سفید برائیڈل گاؤن کے دامن سے نمی اور میلا پن جھلکنے لگا تھا۔ اس کی لاپروائی خود غرضانہ ہو رہی تھی۔

یہ تیسری جگہ تھی۔ ایک طرح سے آخری بھی۔

وہ جانتی تھی کہ پھر اس کے بعد کیا تھا۔ صرف دربدری خاک اور لامتناہی تنہائی۔

شہرام کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اس بات کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی۔ اگرچہ اس کا دل پہلے ہی اس کی گواہی دے چکا تھا۔

لینڈلیڈی کے دروازے تک پہنچ کر اس نے اطلاعی گھنٹی کو دبایا نہیں تھا بلکہ دبائے ہی رکھا تھا۔

وہ اتنی بے چینی اور بے قراری کی حالت میں تھی کہ اسے یقین تھا کہ اگر اب۔ ہاں اب اگر وہ کہیں بھی کسی غلطی یا کوتاہی کی مرتکب ہوئی تو وہ شہرام کو دوبارہ اپنی پوری زندگی میں نہ دیکھ سکے گی۔

وہ ٹھیک سوچ رہی تھی۔

لیکن غلطی کرنے کا وقت آنے والا نہیں تھا۔ بلکہ وہ وقت آکر جاچکا تھا۔ اور وہ شہرام سمیت بہت کچھ کھو دینے والی تھی۔

دروازہ کھلا اور لینڈلیڈی ایمنڈا گھنٹی کے اس غیر مہذبانہ استعمال پر اپنی ناگواری چھپانہ سکیں۔

"فرمایئے۔" بیانکا کو پہچاننے میں انہیں چند ہی لمحے لگے تھے۔ یہ چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ چند لمحے بھی صرف اس وجہ سے لگے کہ وہ آج حد سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔

بیانکا کو دیکھ کر۔ اور اس حالت میں دیکھ کر ان کی ناگواری نے حیرت کی صورت اختیار کرلی تھی۔

"شہرام۔ شہرام کہاں ہے۔"

وہ تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تھی اور مایوس واپس آئی تھی۔ اس کے باعث اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ سوال اس نے بمشکل مکمل کیا۔

لیڈی ایمنڈا کا منہ اتر گیا اس سوال کا جواب یقیناً" بیانکا کو مزید پریشان کردینے والا تھا' وہ ایک ٹک اس کا سراپا دیکھے گئیں۔

وہ وائٹ برائیڈل گاؤن میں ملبوس۔ تازہ کھلے زخم کی مانند گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک اور مہنگے ہیروں سے دمکتے زیورات پہنے ہوئے تھی۔ وہ کہاں سے آرہی تھی۔ کیا چھوڑ کر آرہی تھی۔ ان سارے

سوالوں کے جواب اس کے تن سے لپٹی ایک ایک چیز دے رہی تھی۔ برعکس ہربات کے اس روپ میں وہ اتنی دلکش اور اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اگر اس کے چہرے پر ہوائیاں نہ اُڑ رہی ہوتیں تو لیڈی اہمنڈا اسے گلے سے لگا کر بے تحاشا چوم ڈالتیں۔

"وہ چلا گیا ہے۔" انہوں نے سچ بتا دیا اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

"کہاں۔۔۔؟" زمین اس کے پیروں کے نیچے اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی طرح کانپنے لگی۔

"واپس اپنے ملک۔۔۔ البانیہ" اہمنڈا نے اداسی سے کہا۔

"کب؟"

"کل صبح۔۔۔ اس نے سارا حساب کتاب چکتا کر دیا تھا اور وہ اپنا سارا سامان لے گیا ہے۔ میں نے خود اس کا ایئر ٹکٹ دیکھا تھا۔"

آخری بات کا افسانہ انہوں نے لیول کیا تھا کہ بیانکا یقین کرلے کہ وہ کل صبح چلا گیا ہے۔

وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ وہ واقعی چلا گیا تھا۔

گرنے سے بچنے کے لیے بیانکا نے سیڑھیوں کی ریلنگ کو تھاما تو اہمنڈا کو پتا چل گیا کہ اس کی بات کو سچ مانا گیا ہے۔

دہلیز اور سڑک کے درمیان کی ساکت سیڑھیوں کو اس نے پشت کی طرف سے طے کیا تھا جیسے واپسی کے سفر میں بھی آگے ہی جانے کی خواہش مند ہو اور چکنی سیڑھیوں سے پھسلتے خود کو سنبھالنے کا اس نے تردد ہی نہیں کیا تھا اب اس سے زیادہ وہ اور کہاں گرے گی۔ کھائی میں گرنے والے کے پاس ایک اطمینان تو ہوتا ہے اگرچہ لمحے بھر کے لیے ہی سہی کہ اب وہ اس کے بعد مزید نیچے کہاں جائے گا۔

شاید وہ اس بھاگ دوڑ سے تھک چکی تھی یا خود کو سنبھالتے سنبھالتے ہار گئی تھی۔ یا شاید زمین کی کشش اس قدر بڑھ گئی تھی جو اس کے پورے وجود کو آ لگی کہ وہ برف کی پکی تہہ چڑھے آخری زینے پر ڈھتی ہی چلی گئی۔۔۔ سارے مشکل امتحانوں کے بعد یہ آسان امتحان اس کی زندگی میں ابھی باقی تھا۔ جس میں وہ پہلے سے ہی فیل ہو چکی تھی۔

اس کا نم گاؤن مزید گیلا ہونے لگا اور ٹھنڈے ماربل نے برف کی یخ بستگی کو اس کے پورے وجود میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا اندھیرا بھر گیا تھا۔ جیسے مدتوں ان آنکھوں نے سورج نہ دیکھا ہو۔

"شہرام!" اور یہ لفظ اس کے لبوں سے یوں ادا ہوا جیسے وہ سالوں سے ظلم کا شکار ہی چلی آ رہی ہو۔

گھٹنوں میں منہ دے کر اس نے وہ آسن جما لیا جو کسی کو ابدی طور پر پالینے کے لیے رواں رکھا جاتا ہے۔

"شہرام۔۔۔ اب تم مجھے کیسے ملو گے شہرام؟"

"اب میں تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈوں شہرام۔"

خلاؤں میں دیکھتے ہوئے اس نے زوال آلود سورج سے کہا۔ اور فریبی موسم نے نہ بدلنے کی جیسے بے شمار قسمیں اٹھا لیں۔

"مس بیانکا اب چلیے۔" جوڈتھ نے قریب آ کر بنا کسی تاثر کے عاری لہجے میں پوچھا تھا۔

بیانکا نے سر اٹھا کر جوڈتھ کو دیکھا اور اس کھوکھلے لہجے میں بھی اس نے اپنے لیے چھپے ہوئے طنز کو پا لیا تھا۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے۔۔۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

خاموشی کے طویل لمحوں میں بیانکا جوڈتھ کے پیچھے کے دھاری دار آسمان کو دیکھنے لگی تھی۔

"ہاں چلو!" وہ جیسے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈریس تبدیل کرنے کے بعد اس نے اپنی شادی میں شرکت کی تھی۔

پھر تقریب کے بعد دیر تک چلنے والی پارٹی نے اسے تھکا دیا تھا۔



رات میں وہ ڈینم بلاک میں واقع ایڈون کے گھر آئی

تھی۔ اپنے نئے گھر ایک سال بعد۔۔۔ چار رتوں کے آنے اور جانے کے بعد۔

نیچے ڈانس فلور پر سارے لڑکے لڑکیاں اس کی آمد کے بعد شور مچاتے چلے گئے تھے۔

بیانکا نے ہیڈ فون کانوں سے لگایا تھا اور اس کے بعد وہ مزید کانوں کو طے کیا تھا۔

جب میں خود کو آئینے میں دیکھتی ہوں۔
محسوس کرتی ہوں ایک خوشبو۔
جس میں تمہاری راحت پنہاں ہے
یہ مجھ پر کبھی خواب کی طرح وارد ہوتی ہے۔

بیانکا نے اپنے گلے میں پڑے تعویذ کو ہاتھ لگا کر چھوا تھا اور محسوس کیا تھا۔

"تمہاری محبت نے چیڑ جیسے مضبوط درخت کو بھی مات دے دی ہے شہرام! دیکھو اب اس میں سے چیڑ کی جڑ کی خوشبو نہیں آتی۔۔۔ بلکہ تمہارے وجود کی باس اٹھتی ہے۔"

ایک آنسو اس کی آنکھ میں آیا تھا اور پھر بہتا چلا گیا تھا۔

میں نہیں جانتی تھی کہ محبت کیا ہے۔
لیکن اب میرا دل محبت سے بھر گیا ہے۔
صرف تمہاری محبت سے

تو کیا شاعر بھی اس کے دل کا حال جانتا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے ہٹ میکنگ کرنے لگی

"کیا تمہیں دولت عزیز ہے بیانکا۔"

"میں ان لوگوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہوں۔"

"خدا بننے کی کوشش مت کرو بیانکا۔۔۔ یہ اختیار اللہ کے پاس ہے۔۔۔ اس کے پاس رہنے دو۔" وہ اس کے بٹن کو اوپر کرتی چلی گئی تھی۔

"خدا بننے کی کوشش مت کرو۔۔۔ مت کرو۔۔۔ مت کرو۔" Scratching تیز سے تیز تر ہونے لگی تھی۔

بارش نہیں برسے گی۔۔۔ نہیں برسے گی۔۔۔ نہیں برسے گی' بے تحاشا آنسو بیانکا کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میرے مشاہدے کو اتنا بے مول تو نہ کرو۔" نیچے ڈانس فلور پر لڑکے لڑکیاں پاگل ہو گئے تھے۔

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

ہماری غلطیاں ہمیں لے ڈوبتی ہیں
یہ ڈوبنا بہتا پانی کے ڈوبنے جیسا ہے

"بولو بیانکا۔"

اور آنسوؤں نے اس کی دونوں آنکھوں سے بہنا شروع کر دیا۔ ہونٹ بھینچ کر وہ بڑے ضبط سے اپنا غم پیتی رہی۔

"تم سے محبت کرنے کے بعد میں خود سے محبت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

"میں واپس جا رہا ہوں۔"

Delay (ایفکٹ) نے آواز کو افریقہ کے بڑی آنکھوں والے جادوگروں کی آوازوں کی طرح پراسرار کر دیا تھا۔

میں جا رہا ہوں۔۔۔ جا رہا ہوں۔۔۔ جا رہا ہوں۔

اور وہ چلا گیا۔

بے وفائی کے بعد یادوں کو
آگ لگانا بھی مشکل ہوتا ہے

"میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ یہ میری محبت کے پاس ہے۔"

گلے پر ہاتھ پھیر کر اس نے دوبارہ تعویذ کو چھوا تھا۔

D' B اور A کے بٹن انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ ساؤنڈ سے نکلتی تیز آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی تھی۔ لوگ etc کے نشے میں نیم پاگل ہو گئے تھے۔ جیسے بہت سارے بندر چھوٹی سی جگہ پر ناچ رہے ہوں۔ یہ تیز آوازیں اس کے لیے کارآمد تھیں۔ کوئی اس کے رونے کی آواز کو نہیں سن سکتا تھا۔

"بیانکا میری جان۔"

مارتا نے چلاتے ہوئے اسے پکارا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ بیانکا پچھلے دو منٹ سے مسلسل جنونی انداز سے

Scratching کر رہی تھی۔ مارتا نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھاما تو وہ چونک گئی۔

"میری جان بس کرو۔"

مارتا اس کا آنسوؤں سے لبریز چہرہ دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔

"خود پر اتنا ظلم مت کرو ڈیئر!" اس نے اسے دونوں کندھوں سے تھاما تھا۔ ایک سال ہو گیا تمہارا غم کم کیوں نہیں ہوتا۔ تم نے اسے خود کھویا ہے وہ تو تمہارا ہی تھا۔ پر اپنی غلطی کی خود کو اتنی بڑی سزا تو مت دو جان۔ ہائے اللہ۔ یہ خوب صورت چہرہ جب آنسوؤں سے تر ہوتا ہے تو۔ تو یقین جانو میرا دل خود کشی کرلینے کو چاہتا ہے۔ لگتا ہے دنیا جیسے ختم ہو گئی!"

اسے گلے سے لگائے اور دلاسا دیتے دیتے مارتا خود بھی افسردہ ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بیانکا!"

وہ دھوپ سے دھلا ایک اجلا دن تھا جب کسی نے اسے پکارا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں کچھ سبزیاں پھل اور گھر کی دوسری اشیاء لیے چلی آرہی تھی' جب اس پکار پر اس نے دائیں طرف مڑ کر دیکھا تھا اور دونوں ہاتھوں میں موجود شاپر اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکل کر نیچے زمین پر گر گئے تھے۔ سڑک پر پھل' سبزیاں اور مختلف کین بکھر کر لڑھکنے لگے تھے۔

"کیسی ہو بیانکا؟" نرم آواز سے مسٹر ایڈون نے پوچھا تھا۔

بیانکا پورے چار ماہ بعد ایڈون سے مل رہی تھی۔

بیانکا کی موجودہ زندگی کی کتاب میں سے اگر کلب کی ہنگامہ خیز جاب کے صفحہ کو پھاڑ کر پھینک دیا جاتا تو یہ زندگی ایک بوڑھی کٹھور بیوہ کی سی زندگی تھی۔ ایسی بوڑھی بیوہ جس کے پانچ جوان بیٹے پانچ مختلف براعظموں میں رہائش پذیر ہوں اور وہ روز بلاناغہ گھر سجا کر ان کی آمد کا انتظار کرتی ہو۔

بد قسمتی سے ایک دن ان پانچوں کے انتقال کی خبر آجائے۔

چار ماہ پہلے وہ اپنا مقدمہ جیت چکی تھی۔ اسے اس کے اثاثے واپس مل گئے تھے۔ اگرچہ وہ اس پراپرٹی کا قبضہ حاصل نہ کرسکی تھی جو ڈیڈ الیاس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی لیکن اس کی خوشی کے لیے یہ بات ہی کافی تھی کہ وہ ان لوگوں کو ان کے انجام تک پہنچا چکی ہے۔

یہ کام اتنا آسان نہیں تھا اور بہت زیادہ مشکل بھی نہیں۔

کیتھی نے ٹھیک کہا تھا کہ چور اور قاتل اپنا سراغ کہیں نہ کہیں ضرور چھوڑ جاتے ہیں اور مسٹر ایڈون کی بات بھی درست ثابت ہوئی تھی کہ دولت اپنی طاقت دکھا کر رہتی ہے' اس طرح کے اچھے لوگ بھی بُرے بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

اس کے مقدمے میں تین چار چیزیں فائدے مند ثابت ہوئی تھیں۔

غفار جلال کی محکمہ زراعت سے غلط بیانی' پھر اس طرح پر اسرار طریقے سے روپوش ہو جانا۔ اور مائیکل کی بیوہ۔ جو اس سارے معاملے میں ان ڈائریکٹ ملوث رہی تھی۔ اگرچہ وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی کہ غفار جلال اس کے شوہر کے نام سے کیا کیا کر رہے ہیں تاہم ایک بڑی رقم کے عوض اس نے وہ وہ کیا تھا جو جو ان دونوں نے اسے کہا تھا۔

مائیکل کی بیوہ کے سامنے آنے کے بعد کیس الجھتا ہی چلا گیا تھا۔

کچھ اس مسئلے پر مسٹر ایڈون کے نام کی دہشت تھی دوسرا یہ مقدمہ ایڈون کی نئی نویلی جواں سال بیوی کا تھا۔ ان دو باتوں نے مخالف سمت سے کیس اور موقف دونوں کو بہت کمزور کر دیا تھا۔

عدالت کی ہر کارروائی کے بعد وہ مام ڈیڈ کی قبروں پر جاتی تھی' انہیں ساری تفصیل سے آگاہ کرتی تھی۔ وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھی رہتی تھی۔ اتنی تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اب۔ وہ روتی نہیں تھی۔ بلکہ مسکرا

مسکرا کر انہیں ساری باتیں سناتی تھی۔

اسے اپنے جیت جانے کا کامل یقین تھا۔

وہ پچھلے ایک سال سے دعائیں کر رہی تھی' اسے زندگی کے اندھیروں کا روشنی میں بدل جانے کا انتظار تھا۔ حیضہ مام کی نصیحت غلط نہیں ہو سکتی تھی۔

آٹھ ماہ بعد انتظار سے پتھرائی اس کی آنکھوں کو قرار آیا تھا۔ وہ مقدمہ جیت گئی تھی اخبارات اور میگزین نے اسے۔ Tishri Ioud کی مالک ڈی جے بیانکا کو اس کی جیت کی مبارک باد دی تھی۔ اور اس دوران میں ان کو اس مشہور ڈی جے کی ذات کے تاریک پہلوؤں کا اندازہ ہوا تھا۔

الیاس احمد کے قتل کا الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا لیکن حیضہ مام کا قتل ثابت ہو گیا تھا۔ ان سب کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ تایا غفار' چچا جلال' تائی شہناز اور چاچی فیروزہ اور احمد جس کا کیریر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا' وہ بھی کھو بیٹھے تھے۔

وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ نہ تو وہ مسٹر ایڈون کی وجہ سے یہ مقدمہ جیت سکی ہے۔ اور نہ ہی غفار جلال کی غلطیوں کی وجہ سے۔ وہ خود سمجھتی تھی کہ کیس اس کی طرف سے اس قدر جھول دار تھا کہ اللہ کی رضا اور مدد کے بغیر وہ کبھی بھی فاتح نہیں ہو سکتی تھی۔

جس دن وہ یہ مقدمہ جیتی تھی اسی دن اس کی ایڈون سے آخری بار بات چیت ہوئی تھی اگرچہ یہ تعلق بہت پہلے کا ہی ٹوٹ چکا تھا۔ شادی کی پہلی رات سے ہی۔

شہرام کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب وہ مایوس ہو کر جوڈتھ کے ساتھ واپس گاڑی میں بیٹھی تھی تو اس نے اسی وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے اب آگے اپنی زندگی میں کیا کرنا ہے۔

ڈینم بلاک مسٹر ایڈون کے گھر آکر اس نے اپنی گھبراہٹ پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔

"مجھے تم سے ڈائیورس (طلاق) چاہیے ایڈون

۔ ابھی ۔ وضاحت نہیں دوں گی کہ میرے پاس وضاحت دینے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اور میری خطا اس قدر بڑی ہے کہ ساری رات بھی معافی مانگتی رہوں تو تسلی نہ ہوگی۔"

"بیانکا یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"وہی جو تم سن رہے ہو ایڈون۔ مجھے تم سے محبت نہیں تھی۔ اس بات کا اندازہ تو تمہیں بھی ہوگا۔ پر مجھے تم سے نفرت بھی نہیں تھی۔ مجھے لگا تھا تمہارے ساتھ زندگی بہتر گزر جائے گی۔ لیکن افسوس میرے پاس اب تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا۔ نہ محبت۔ نہ خلوص۔ نہ وفاداری۔"

"بیانکا۔ تم؟" ایڈون نے حیرت اور منت سے پکارا تھا۔

"نہیں ایڈون! تمہارا کوئی بھی لفظ مجھے جانے سے نہیں روک سکتا۔ اور میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ تم اتنے اچھے ہو کہ تمہارے آگے میں خود کو ہمیشہ داغ دار سمجھتی رہوں گی۔"

"تمہیں وہاں ہی انکار کر دینا چاہیے تھا بیانکا۔"

ایڈون تاسف سے بولا تھا۔

"وہاں انکار اس لیے نہیں کیا کہ میں میڈیا والوں کے سامنے تمہارا تماشا نہ لگوانا چاہتی تھی۔ اب بھی ایسا نہیں چاہتی۔ تم جب تک چاہو اس طلاق کو راز میں رکھ سکتے ہو۔ چاہو تو ساری زندگی۔ میرا نہیں خیال کہ تمام عمر اب میری زندگی میں کوئی آنے والا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

یہ آخری الفاظ تھے جو اس نے اس رات ایڈون سے کہے تھے۔ پھر وہ جوڈتھ کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ آگئی تھی۔

"دلوں کے ملا دینے کا وصف اللہ کے پاس ہے۔ وہ یہ کام وقت آنے پر بخوبی کرے گا۔" اسے اللہ پر یقین تھا۔

ایک ہفتے بعد ایڈون اس کے اپارٹمنٹ آیا تھا۔

"میں تمہارا مقدمہ ضرور لڑوں گا بیانکا۔ بنا کسی فیس اور جذبات کی بھیک کے۔" بیانکا چند لمحے خاموشی

سے لیڈون کو دیکھ رہی تھی۔

"مگر اچھائی کوئی روپ بدلے تو وہ روپ یقیناً" تمہارا ہو گا لیڈون" بیانکا نے اپنے دل میں سوچا تھا۔ زندگی کی ساری آسائشیں اسے واپس مل گئی تھیں۔ لیکن دل کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی غار کی طرح تاریک اور خالی تھی۔ ایسا غار جہاں برسوں سے کسی ذی روح نے سانس تک نہ لیا ہو۔

☆ ☆ ☆

"ایک سال ہو گیا بیانکا۔ تمہارا کوئی میک اپ نہیں گیا۔ میرا نہیں خیال کہ اب دولت کی کمی اس چیز کے آڑے ہو گی۔" ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے لیڈون نے ہنس کر کہا تھا۔

"آپ کافی لیں گے یا کچھ اور؟" وہ تھیلیوں میں سے مختلف چیزیں نکال کر کچن کاؤنٹر پر رکھ رہی تھی۔ درحقیقت وہ لیڈون کے سامنے بیٹھنے سے گریزاں تھی۔

"یہاں بیٹھو۔ بیانکا۔ میرے ساتھ۔" لیڈون کے لہجے میں کچھ تھا۔ وہ نا سمجھ ہوتے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"بہت عرصہ میں یہ ہی سمجھتا رہا کہ تمہاری نیت مجھے دھوکا دینے کی ہی تھی۔ یہ شادی ہو بھی جاتی تو تم نے مقدمہ جیت لینے کے بعد مجھ سے طلاق لے لینی تھی۔ مگر میں غلط ثابت ہوا۔ تمہیں سمجھ نہیں سکا۔ تم کسی اور کو چاہتی ہو' یہ بات میں کیوں نہ جان سکا۔" لیڈون نے پوچھا تھا۔

"مجھے خود اس بات کا اندازہ بہت بعد میں ہوا کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"پھر اب تم اکیلی کیوں ہو بیانکا۔ اس کے ساتھ کیوں نہیں ہو۔ کیا وہ تم سے ناراض ہے۔ خفا ہو گیا ہے۔ مان نہیں رہا ہے۔"

"وہ مجھ سے کھو گیا ہے۔" پلکیں جھکا کر آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے اس نے افسردگی سے کہا تھا۔

"غلطی میری بھی ہے۔ مجھے اب تک طلاق کا اعلان کر دینا چاہیے تھا۔ شاید وہ ابھی تک یہ ہی سمجھ رہا ہو کہ تم میرے ساتھ ہو۔"

لیڈون نے کہا تو بیانکا چونکی تھی۔ ہاں۔ ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے آج تک اس رخ سے کیوں نہ سوچا۔

"حیران مت ہو بیانکا۔ بلکہ خوش ہو جاؤ۔ وہ مل گیا ہے۔ یہ دیکھو۔" لیڈون نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگ میں سے ایک پارسل نکالا تھا۔

"یہ اس نے تمہیں تمہارے مقدمے کی جیت اور ہماری شادی کی پہلی سالگرہ کے گفٹ کے طور پر بھیجا ہے۔ وہ شادی جو۔ خیر چھوڑو۔ اب آکر مجھے اندازہ ہوا کہ۔"

"کیا۔" بیانکا چلائی تھی۔

"کیا واقعی۔؟"

اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ لیڈون اپنی روانی میں کیا بولتا جارہا ہے۔ اور جب اسے یقین آیا تو اس نے جھپٹتے ہوئے پیکٹ کو تقریباً" چھینا تھا۔

ایک شفاف کرسٹل گلوب۔ بٹن دبانے سے جس کے اندر برف باری ہوتی ہے اور میوزک چلتا ہے۔ بیانکا کو نجانے کیوں یہ میوزک دنیا کا سب سے خوب صورت ترین میوزک لگا۔

اس نے جلدی جلدی سے خط کو پڑھا تھا۔ مقدمے کی جیت پر شہرام نے اسے مبارک باد دی تھی۔

"اور شادی کی پہلی سالگرہ بھی مبارک ہو بیانکا۔ تنہائی میں جینے والے تمہاری دعاؤں کے منتظر ہیں۔

شہرام"

آخری لائن پڑھ کر بیانکا ہنسی تھی۔ اور ہنستی ہی چلی گئی تھی۔

"یہ لائن تم نے نہیں لکھی شہرام۔ بلکہ یہ اللہ نے تمہارے ہاتھوں سے لکھوائی ہے۔" پارسل کے باہر پتا لکھا ہوا تھا اور یہ پتا ہی اب اس کی متاع جان تھا۔

لمحے بھر میں بیانکا نے خود کو دنیا کے تمام حسین باغوں کا محافظ تصور کر لیا تھا۔

"خوش ہو بیانکا؟"

"ہاں۔ لیڈون۔ تمہاری شکر گزار بھی ہوں۔"

"میں اس طلاق کا اعلان اب جلد ہی کردوں گا۔"

لیڈون کے جانے کے بعد اس نے تین چار ائرلائن کمپنیوں کے آفس فون کیا تھا اگر آپ پرو پروسسنگ میں میری ذمہ داری خود ہینڈل کریں تو میں جانے کے لیے آپ کی ایئرلائن کا ہی ٹکٹ لوں گی۔

اس نے تین چار ایئرلائن کمپنیوں کو ایسا کہا تھا۔

یہ طریقہ کار اگرچہ کافی پرانا ہو چکا تھا لیکن دولت کی طاقت تو آج بھی اتنی ہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ارجیر کی فضا میں کائنات بننے کے پہلے دن کی خاموشی تھی۔ بیانکا نے اپنے دل کو بری طرح دھڑکتے ہوئے پایا تھا۔ مدریسا ایئرپورٹ سے یہاں تک کا سفر اس کے دل کی دھڑکنوں کو تیز سے تیز تر کر رہا تھا۔ کل رات سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پھر بھی اسے بھوک نہیں تھی۔ وہ سوئی بھی نہیں تھی۔ اور اسے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔

ٹیکسی سے اتر کر اس نے ایک طویل اور خوشگوار سانس اندر کھینچا تھا۔ جنگلی درختوں سے ٹکرا کر آتی ہوا میں خون کو مصفیٰ کر دینے کی طاقت تھی۔ اس گہرے سانس نے اس کے سفر کی ساری تھکن کو پلک جھپکتے میں دور کر دیا تھا۔ وہ مسکرائی۔ شہرام کی نقل اتارنا فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔

اس نے چاروں طرف نظر گھمائی۔ اونچے اونچے درخت۔ بل کھاتی پگڈنڈیاں' ڈھلوانی سڑکیں۔ اور دور تک پھیلا چھوٹے بڑے سبز پہاڑوں کا سلسلہ۔ یہ دیس شہرام کی باتوں سے زیادہ مسحور کن تھا۔

اپنا مطلوبہ پتا ڈھونڈنے میں اسے صرف کچھ ہی دیر لگی تھی۔ "مہمان ذائقہ" کا بورڈ دور سے ہی چمک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتی گئی اور زمین اسے پیچھے کو دھکیلنے کی کوشش میں الٹ ہو گئی تھی جو اس کے قدموں کو زمین پر ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ ریسٹورنٹ کے آگے جا کر اس نے بمشکل خود پر قابو پایا تھا۔

"مجھے شہرام سے ملنا ہے۔"

اس نے داخلی دروازے پر کھڑے ایک لڑکے سے کہا تھا۔ دوسری بولی میں پوچھے گئے سوال کے باعث لڑکا بیانکا کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ اپنے سوال کو مزید تھہر تھہر کر دہرانے کا سوچ ہی رہی تھی جب اس نے اپنے دائیں طرف سے ایک آواز سنی تھی۔

(بی۔ ٹی۔ کا۔ (بیانکا۔)

آواز میں نسوانیت اور خوشی کی پھوار پھوٹتی تھی اور چاروں طرف پھیلتی چلی گئی تھی پھر بیانکا نے داخلی دروازے کے ساتھ بابلی کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ایک عورت کو اپنی طرف تیزی اور جوش سے بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس عورت کے سر پر سفید کسانہ بندھا ہوا تھا۔ اور سفید ایپرن اس کے پورے وجود کو ڈھک نہیں پا رہا تھا۔

دعائے مغفرت

مقبول مصنفہ نعیمہ ناز کی والدہ زاہدہ خاتون طویل علالت کے بعد اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

ماں کی دائمی جدائی بہت بڑی محرومی ہے۔ انسان کو عمر کے ہر دور میں ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نعیمہ ناز کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نعیمہ ناز اور دیگر اہل خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین

قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

☼ ☼ ☼

اماں زنتوبیہ اپنی زندگی میں بہت سے سیاحوں سے مل چکی تھیں۔ اکثر سیاح ان سے ترکیب وغیرہ پوچھا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے دنیا کی مختلف زبانوں کی چھوٹی بڑی کترنیں اکٹھی کر رکھی تھیں۔ ایسے میں بیانکا سے بات چیت میں ان کو ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔

وہ جو شہرام کا پوچھتے وقت تجسس اور اشتیاق سے لبریز تھی اب ان کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔

"میں۔ میں بہت بری ہوں۔ آنٹی زنتوبیہ۔ میں نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

"نہیں۔ تو بری نہیں ہے۔ وقت برا تھا۔ جس نے تجھ سے یہ فیصلہ کروایا۔" وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی تھیں۔

"اور کیا کیا بتایا اس نے میرے بارے میں۔"

"سب کچھ۔ جتنا وہ ایک وقت۔ ایک رات کے اندھیرے میں بتا سکتا تھا۔ اور پھر صبح ہوتے ہی وہ چلا گیا۔"

"آپ نے اسے کیوں جانے دیا۔ آپ اسے روک لیتیں۔"

"وہ وقت بھی برا تھا۔ روکتی تو اس کے دل میں کسک رہ جاتی کہ اس نے ماں کا حکم نہیں مانا۔ اب جہاں ہوگا اس کسک سے تو بے پروا ہوگا۔"

"لیکن وہ چلا کیوں گیا؟"

"سیرین اور حسنی کے بیٹے کا عقیقہ تھا اس دن۔"

"تو کیا۔ کیا وہ اب بھی سیرین سے۔"

بیانکا کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"کچھ نئے زخم پرانے زخم بھی جگا دیتے ہیں بیٹی۔ تو پریشان نہ ہو۔"

"میں اسے کہاں ڈھونڈوں گی اب۔ میں تو پچھلے ایک سال سے متلاشی ہوں۔ اتنے بڑے دیس میں۔ اتنے بڑے ہجوم میں۔ میں اسے کہاں کہاں تلاش کروں گی۔"

"تو ڈھونڈے گی۔ جن سے محبت ہوتی ہے ان کا چہرہ ہزاروں لاکھوں کے مجمعے میں بھی پہچانا جاتا ہے۔"

"اگر وہ لاکھوں کے مجمعے میں موجود نہ ہو تو۔ اگر وہ اس دیس میں ہی نہ ہو تو؟"

"ابھی میری سانسیں ہموار ہیں۔ جب یہ اکھڑنے لگیں گی تو میں سمجھ جاؤں گی کہ اب اس کے قدموں تلے ایک نئی دھرتی ہے۔ جیسا پچھلی بار ہوا تھا۔"

"اور اگر میں اسے پھر بھی نہ ڈھونڈ سکی تو۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"تو کبھی نہ کبھی تو وہ یہاں واپس آئے گا ہی۔ اور پھر میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جائے گا۔ یہاں۔ تجھے محسوس کرنے کے لیے۔"

اماں زنتوبیہ نے اشتیاق آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو بیانکا نے ایک جھٹکے سے اپنا سر ان کی گود سے اٹھایا تھا۔ شاید اس کی چوری پکڑلی گئی تھی۔ وہ خود بھی تو کتنی دیر سے یہ ہی کر رہی تھی۔ ان کی گود میں سر رکھے وہ شہرام کے وجود کی مہک کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

زمردی ذرے اڑاتی دھوپ چار اطراف کی راجدھانی پر قائم و دائم تھی۔ سورج کی شعاعوں میں ٹھمری کے وہ راگ قید تھے جس میں طنبورے کی گونج توت انجیر کے سفید پتوں کی طرح کڑک ہوتی ہے۔

ٹرین سے اتر کر وہ پلیٹ فارم سے باہر نہیں گئی تھی، بلکہ وہیں ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تاتاریوں کے پیش گوئیاں کرنے والے رمالوں کی آنکھوں والی چمک اور اداسی تھی۔

البانیہ میں رہتے ہوئے اسے پورا ایک مہینہ ہوگیا تھا۔ شہرام کو تلاش کرتے کرتے پورے تیس دن۔

اور اب وہ واپس جا رہی تھی۔ وہ تھکی نہیں تھی، اگر کوئی اسے یہ بتا دیتا کہ شہرام فلاں پہاڑ پر موجود ہے جہاں جانے کا راستہ ایک سال میں مکمل ہوتا تو وہ بنا سوچے سمجھے اس پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیتی۔ لیکن یہ تلاش بے تلاش تھی۔ وہ تو خدا سے صرف یہ ہی دعا کر سکتی تھی کہ شہرام اماں زنتوبیہ سے جلد ہی مل لے۔ یہ ملاقات ہی اس کے لیے زندگی کے نئے پیغاموں کی پیامبر بن سکتی تھی۔

اماں زنتوبیہ سے ملنے کے اگلے دن وہ کوریئر سروس والوں کے آفس گئی تھی۔ پالیسی میں تبدیلی کی وجہ سے بھیجنے والے کو اپنا نام اور پتا لازما" لکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس چیز پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی کہ ایڈریس کس جگہ کس شہر کا لکھا جا رہا ہے۔

"آپ سیریل نمبر دیکھ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ پارسل ازمیر سے بھیجا گیا ہے یا کسی اور جگہ سے؟" بیانکا نے کہا تو ریسیپشنسٹ لڑکے نے پارسل لے کر کمپیوٹر پر سیریل نمبر لکھا۔

"یہ پارسل تیرانا شہر سے بھیجا گیا ہے۔"

اور اسی دن وہ تیرانا شہر آگئی تھی۔ اس نے شہرام کو تلاش کیا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں، لمبے لمبے بازاروں میں اور اونچے اونچے مالوں میں۔ وہ تیرانا کے تمام پارکوں میں گئی اور جاتی رہی۔ اس نے فوک فیسٹیولز میں شرکت کی اور سارا سارا دن بلا مقصد سڑکوں پر گھومتی رہی۔ اسے نہیں ملنا تھا اور وہ نہیں ملا۔ ابھی شاید اللہ کی مرضی نہیں تھی۔ شاید اسے اس چیز کے لیے بھی مسلسل نماز حاجت پڑھنی تھی۔ کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ جس کے پاس محبت نہ ہو اس کے پاس پھر کچھ نہیں رہتا۔

سر اٹھا کر اس نے ایک نظر پیلے آسمان کو دیکھا۔ سونا پگھل کر کندن کی شکل میں سارے آسمان پر بچھا پڑا تھا۔ وہ بڑے عرصے بعد آفتاب سے نظریں چار کر رہی تھی۔

حیفہ ماما کہا کرتی تھیں۔

"چمبل کے درخت پر جب جب بہار آتی ہے سارے درختوں میں سب سے خوب صورت درخت

لگتا ہے۔ لیکن اس کی لکڑی کسی کام کی نہیں ہوتی۔ انسان کی مثال بھی ایسی ہے یہ اوپر سے کسی قدر خوشنما کیوں نہ ہو جب تک محبت کرنے کے فن سے ناآشنا ہے، سنبل کی طرح بے کار ہے۔"

"محبت کرنے کا فن ہم سیکھ جاتے ہیں مام۔ لیکن محبت حاصل کرنے کے ہنر میں کبھی بھی ماہر نہیں ہو پاتے۔" اس نے خود سے کہا اور کھینچ کر گلے سے تعویذ نکال لیا تھا۔

"تم سمجھ نہیں سکے شہرام۔ تم اتنی سی بات نہ سمجھ سکے کہ یہ تعویذ دراصل منحوس ہے۔ یہ جس کے پاس ہوتا ہے وہی محبت سے محروم ہوتا ہے۔"

تعویذ کو آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے اس نے اس کی چمک دار سطح کو دیکھا۔ ایک آٹھ نو سال کی بچی جو اپنے ننھے ہاتھ کے مکے کے اوپر ٹھوڑی ٹکائے اپنی آب دار آنکھوں میں کسی اجنبی جذبے کا انتظار لیے نہ جانے کس طرف دیکھتی نظر آتی ہے۔

"بابا زلاری سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ وہ اس طرح کی شبیہہ اس پر کندہ کریں۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ "حب" تعویذوں پر ازل سے پھولوں اور راج ہنسوں کا راج ہے۔ پھر آخر انہیں یہ مختصر خاکہ گھڑنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے تعویذ کو آخری بار دیکھا اور پھر پرے ہوا میں اچھال دیا۔

کوئی نئی ٹرین پلیٹ فارم پر آکر رکی اور رش بڑھنے لگا۔

بیانکا نے ستون کے ساتھ سر جوڑ لیا۔ البانیہ میں آخری دن اور یہ آخری لمحے اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے۔ دوبارہ اس جگہ پر بلاوا اسے نہ جانے کب آئے گا۔ پہاڑوں سے گھرے اس دیس میں جس کی فضا میں شہرام کی سانسوں کی مہک تھی۔ بے تحاشا رش میں اس نے اپنا سامان پکڑ کر باہر نکل جانے کا ارادہ باندھا، لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ اس متحرک ہجوم میں ایک چیز تھی جو ساکن تھی۔ گہرے منجمد پانیوں میں مدتوں سے پڑی ہوئی بند صدف کی طرح۔

ٹرین کے اندر کھڑکی کے پار بیٹھا وہ پانی کو اس قدر آہستگی سے پی رہا تھا کہ گلاس کے اندر کا سیال کسی بے رنگ جیلی کی طرح جما ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی شیو بنا اسٹائل کے بڑھی ہوئی تھی اور سات آٹھ دنوں کی بڑھی شیو کے بال اس کے سرخی مائل گالوں کے نیچے کی لو کے قریب دو دائرے بناتے تھے۔

بیانکا نے ان دائروں کو کھوجا اور خود کہیں کھو گئی۔ ٹرین نے چلنے کا اشارہ دے دیا اور بیانکا وہیں ستون کے ساتھ سر جوڑے حیرت سے اسے گھورتی رہی۔ شہرام کو دیکھ لینے کی خوشی شاید اس قدر زیادہ تھی کہ وہ ستون کے ساتھ بت بن کر کھڑی رہی اور ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔

☼ ☼ ☼

شہرام نے جھٹکے سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ ستون خالی تھا۔

"میرے تخیل۔۔۔ نہ جانے یہ میرا پیچھا کب چھوڑیں گے۔"

افسردگی سے اس نے خود سے کہا۔ بیانکا تو اسے ہر وقت، ہر جگہ نظر آتی ہی تھی۔ اس گزرے ہوئے سال کا کوئی دن ایسا نہیں تھا جو اس کی یاد کے بغیر گزرا ہو۔ وہ اس سے روز ملتا تھا، سڑکوں پر، بازاروں میں وہ اسے ہر جگہ نظر آتی تھی۔ لیکن آج اس کا تخیل اس قدر بھیانک کیوں تھا۔ وہ حسن جس کی صرف ایک بوند پورے سمندر کے پانی کا رنگ بدل دینے کی صلاحیت رکھتی تھی آج ہمیشہ سے مختلف عکس کیوں دے رہی تھی۔

شہرام کو Owen Sni کی ابوالہول یاد آگئی۔ جس میں ایک لڑکی ابوالہول کے پیچھے کھڑی ہے، اس کا سہارا لیے، اس کو پناہ بنائے۔ جس کی بھنوؤں میں پریشانی کے باعث گڑھے پڑ چکے ہیں۔

"نہیں میرا تخیل غلط ہے۔ اب بھلا اس کو کسی سہارے کی کیوں ضرورت ہوگی۔"

شہرام نے دکھ سے سوچا اور کھڑکی سے اپنا چہرہ ہٹا لیا۔

انٹرنیٹ پر وہ دونوں کی شادی کی تصویریں دیکھ چکا تھا۔ پھر مقدمے کی روداد بھی وہ وقتاً فوقتاً حاصل کرتا تھا۔ خود وہ بیانکا سے بھی زیادہ بیانکا کے لیے دعاگو تھا۔ چار ماہ پہلے بیانکا مقدمہ جیت گئی تھی اور شہرام کو سچی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ لیکن قرار نہیں۔۔۔ اس کی زندگی ایک بار پھر منتشر ہو چکی تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنے گھر والوں سے دور تھا۔ اماں نتھو یہ سے، بابا زلاری سے۔۔۔ طامیر سے۔۔۔

اسی طرح ایک دن بازار میں بے مقصد ٹہلتے ہوئے شہرام کو ایک کرسٹل گلاب پسند آگیا تھا۔ جس میں بٹن دبانے سے برف باری ہوتی تھی اور میوزک چلتا تھا۔ آگے جو ہوا اس میں اس کا ارادہ شامل تھا، نہ سوچ۔ کسی تیسری قوت نے اس سے یہ کام کروایا تھا۔ شہرام نے ساتھ ایک خط بھی لکھ کر ایڈون کے پتے پر ارسال کر دیا تھا۔ جس میں بیانکا کو اس کے مقدمے کی جیت پر مبارکباد دی گئی تھی۔

"بیانکا کی زندگی بہت آگے نکل گئی ہے۔ شاید میں اب اسے یاد بھی نہ ہوں۔"

یہ سوچ کر شہرام نے اپنا موجودہ پتا بھی نہیں لکھا تھا۔

اور آج وہ جس انداز میں اسے ستون کے ساتھ کھڑی نظر آئی تھی اس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

"خدا کرے تم خیریت سے ہو بیانکا! تمہیں کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔" اس نے دعا کی۔

"شہرام۔۔۔" ایک پکار جس میں جھرنا بہنے کی سی جھنکار تھی نے پورے ڈبے میں بازگشت کی۔

"تو کیا یہ بھی میرا وہم ہے۔" شہرام چونکا۔

"میں آگئی ہوں شہرام۔ ہمیشہ کے لیے۔"

شہرام جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ فریب اور حقیقت میں فرق نہیں کر پا رہا تھا۔ کیا یہ فریب مشابہت تھا یا خیالات کا بکھر جانا۔ بیانکا شوخی سے مسکرا رہی تھی اور یہ ادا گزرے سال کے تمام تصورات سے بڑھ کر تھی۔ دل کی دھڑکن تیز کر دینے والی۔۔۔

"یہ لو۔۔۔" بیانکا نے اسی طرح مسکراتے ہوئے تعویذ حب شہرام کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔

"اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں سے پہنا دو۔" اس نے ایسے کہا جیسے سوتے جاگتے وہ اسی ایک جملے کی مشق کرتی رہی تھی۔" اور شہرام نے جانا کہ حقیقت تخیل سے نکل آئی ہے اور جو بے پایاں اور فسوں گر ہے۔ وہ بیانکا کی طرف بڑھا۔

بیانکا دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگی تھی کہ البانیہ کی ٹرینیں امریکہ کی ٹرینوں کی طرح پلک جھپکتے میں نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتیں۔

تعویذ کو ڈھونڈنے میں اسے چند لمحے لگے تھے اور پھر وہ تیزی سے ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔

شہرام نے مسکراتے ہوئے تعویذ کو بیانکا کے ہاتھ سے لیا، کیونکہ سب ہی وضاحتیں بیانکا کی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی تھیں اور بیت چکے وقت کی کہانیاں بھی کہ وہ ایسے کتنے ہی ستونوں سے ٹک کر اس کی راہ دیکھتی رہی ہے۔

ٹرین ایک سرنگ میں داخل ہونے لگی تو بیانکا نے شہرام کے ہاتھ کے لمس کو اپنے ہاتھ سے ٹکراتے ہوئے محسوس کیا۔

جب کے تعویذوں پر پھول نقش ہو، راج ہنس یا مختصر خاکے، انہیں صرف پہننے والے ہی اپنی محبتوں کی طرح امر کر سکتے ہیں۔ چند لمحوں بعد ٹرین تاریک سرنگ سے باہر نکلی تو اس نے شہرام کی روشن آنکھوں میں دیکھا۔ ان آنکھوں میں بدھا کی بند آنکھوں کے اسرار و کشف کی الوہیت تھی۔

اس کی خالی گردن خالی نہیں رہی تھی۔ اس کا بنجر دل آباد ہو گیا تھا۔ وہ حب کے تعویذ کی مالک بن گئی تھی۔ ٹرین کے باہر تابعدار سورج نصف النہار کے زاویے سے آگے بڑھتے حب کے سارے عکسوں کو جا بجا بکھیر رہا تھا۔

☼